البیان امرت سر　　مارچ ۱۹۴۳ء　　جلد ۵، نمبر ۳

اَلدُّرُّ الثمین

لِملکِ الیمین

از
مولانا تمنّا عمادی مجیبی
پھلواروی

شایع کردہ
دفتر اُمت مُسلمہ۔ توحید باغ۔ امرتسر

شذرات

رحلت حضرت علامہ حافظ محمد اسلم صاحب جیراج پوری کی والدہ محترمہ کچھ عرصہ سے بیمار تھیں، اس سلسلے میں پچھلے دنوں آپ وطن تشریف لے گئے۔ حالت کچھ بہتر ہوگئی تو دہلی واپس آگئے۔ اس کے بعد اطلاع آئی کہ انہوں نے انتقال فرمایا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ان کی عمر ۸۰ سال تک پہنچ چکی تھی، بڑھاپے اور بیماری نے بہت کمزور کردیا تھا۔

آپ کی زندگی مسلمان ماؤں کے لیے مبارک نمونہ تھی، مصیبت زدوں کے ساتھ ہمدردی، محتاجوں پر احسان کرنے میں سبقت اور مسارعت الی الخیر ان کی امتیازی خصوصیتیں تھیں، جن کی وجہ سے بہت سے لوگ ان کی موت پر اشک بار ہوئے، آپ دعا میں بہت اعتقاد رکھتی تھیں اور کم از کم اپنی اولاد کے حق میں مستجاب الدعوات تھیں، اللہ تعالیٰ ان کو اپنی رحمت میں جگہ دے اور ان کے جلیل القدر فرزند (حضرت علامہ) کو صبر جمیل کے ساتھ اپنی پاک کتاب کی حقیقی خدمت کے لیے طویل عمر و صحت سے بہرہ ور رکھے۔

آیندہ البیان اپریل نمبر میں مندرجہ ذیل مضامین کا انتظار فرمائیں: (۱) "حقیقت حدیث" از علامہ اسلم جیراج پوری۔ یہ مضمون آپ کے مضمون علم حدیث کا تکملہ یا تتمہ ہے، ان سے پہلے دو مضمون وضع حدیث اور منکرین حدیث شایع ہو چکے ہیں، ان چاروں کے پڑھ لینے سے فن حدیث کا آغاز و انجام تمام سامنے آجاتا ہے۔ جنگ کے بعد ان شاء اللہ ان کو کتابی صورت میں بھی شایع کردیا جائے گا۔ (۲) دو قرآن مسلسل از ڈاکٹر برق صاحب بالقابہ۔ یہ مضمون عوام و خواص میں بالاجماع پسند کیا جارہا ہے، اس کے تعارف کی ضرورت نہیں۔ (۳) اعجاز قرآن از سید حسرت مسانوی بی اے۔ جناب درانی کے انگریزی مضمون کا ترجمہ ہے۔ علامہ اقبال کے فلسفیانہ خیالات سے ماخوذ ہے، دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ (۴) قصیدہ عربی مولانا تمنا عمادی۔ قرآن مجید کے فضائل میں ۱۹ اشعار کا شاندار قصیدہ ہے۔ تحت الاشعار اردو ترجمہ بھی دے دیا گیا ہے۔

اَلدُّرُّ الثمین لملک الیمین قرآن مجید میں غلاموں کی حیثیت کے متعلق کیا ارشاد ہوا ہے۔ زیر نظر نمبر میں یہ مسئلہ حضرت علامہ تمنا کی عمیق سعی و کاوش کا نتیجہ ہے۔ ناظرین اس کو پورے غور اور کامل توجہ سے پڑھیں گے تو مولانا کی دقت نظر اور شغف قرآنی کی ستائش کرنے پر مجبور ہو جائیں گے مولانا اس کو تحقیق کی آخری منزل نہیں سمجھتے، یہ آپ کی فراخ دلی اور تقویٰ کی علامت ہے۔ آپ معترضین کو دعوت دیتے ہیں کہ

صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لیے

اس بنا پر ہم نے کہیں کہیں حاشیہ پر حضرت مولانا سے اختلاف کی جرأت کی ہے، مولانا اپنے خطوط میں وعدہ فرماتے ہیں کہ تمام اعتراضات پر ایک ضمیمہ کی صورت میں غور کیا جائے گا اور اپنے پیش کردہ خیالات میں مناسب تغیر و تبدیل سے بھی آپ کو ہرگز باک نہیں ہوگا۔ یہی تحقیق کی راہ ہے، جزاہم اللہ۔ اس مضمون کے صفحہ ۲۰ پر مولانا نے عربی میں طویل حاشیہ لکھا ہے، جس کو ہم نے ناظرین کی سہولت کے لیے ترجمہ و تلخیص کی صورت میں پیش کردیا ہے۔ اس میں اگر کوئی سقم رہ گیا ہو تو اس کی ذمہ داری ہم پر ہے نہ کہ مولانا پر۔

غور سے پڑھیے ہم بار بار اعلان کر چکے ہیں اور آج پھر دہراتے ہیں کہ جواب طلب امور کے لیے جوابی کارڈ یا لفافہ بھیجا کریں۔ ایسے سوالات کے جواب کی دفتر سے ہرگز توقع نہ رکھیں جن کے جواب دینے کا خرچ دفتر پر ڈالا جائے۔

ادارہ

الانتباہ

اس مضمون سے اس کے سوا کچھ اور مقصود نہیں کہ حقیقی طور سے محض دیانۃً تقلیدی کشاکش اور اسلاف پرستی کی کش مکش سے آزاد ہوکر ہر صاحب عقل و بصیرت اس موضوع پر ٹھنڈے دل سے غور کرسکے۔

ہر صاحب نظر سے میری یہ استدعا ہے کہ میری تحریر پر مخلصانہ و منصفانہ نگاہِ غور ڈال کر نفس مسئلہ پر اپنی صحیح رائے حوالہ قلم فرماکر مجھے اس سے مطلع فرمائیں، تاکہ میں دوبارہ اس مسئلہ پر غور کرسکوں۔

مبحث کو الجھاؤ سے بچانے کے لیے احادیث و روایات سے سردست قطع نظر کیا گیا ہے مجھ کو معلوم ہے کہ ایک جماعت، بلکہ بڑی جماعت ایسی ہے جس کو صرف قرآنی تصریحات، باوجود ان کے مفسر و مفصل اور مبین و مبیّن ہونے کے مفید تشفی نہیں۔ ان کے دِلوں کی گرہیں صرف روایات ہی سے کھلتی ہیں۔ اس لیے قرآنی تصریحات پر غور و بحث ہو جانے کے بعد بشرط ضرورت میں روایات و احادیث پر بھی بحث کروں گا۔ یا اگر کوئی دوسرے بزرگ اس میں پہل فرمائیں گے تو میں بطیب خاطر ان کی پیش کردہ احادیث و روایات پر نہایت ٹھنڈے دل سے غور کروں گا۔ مگر سردست اس کو تو دیکھ لیا جائے کہ خود قرآن حکیم بنفس نفیس اس موضوع پر کیا ارشاد فرما رہا ہے۔

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

تمنّا عمادی مجیبی غفرلہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الدر الثمین —— لملک الیمین

قرآن مجید اور مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ پورے قرآن مجید میں کہیں بھی کوئی ایسا حکم نہیں ملتا کہ جہاں جو قیدی تمہارے ہاتھ آئیں، تم اُن کو اپنا غلام بنالو اور اُن کی عورتوں کو لونڈیاں بنا کر بلا نکاح اپنے مصرف میں لے آؤ۔

اسی لیے ایک جماعت اس وقت کے کم بضاعت مفکرین کی ایسی ہے جو سرے سے اس کی منکر ہے کہ ایسا کرنا قرآن کی رو سے جائز ہی نہیں۔ کیوں کہ قرآن میں تو بہر حال قیدیوں کو آزاد ہی کر دینے کا حکم ہے: وَاِمَّا مَنًّاۢ بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً یا تو اُن قیدیوں کو احساناً چھوڑ دو یا فدیہ لے کر چھوڑ دو۔ غرض چھوڑ ہی دینے کا حکم ہے۔ لونڈی غلام بنالینا محض ظلم اور فقہاء کا خود ساختہ طریقہ ہے جو بعد کو نکالا گیا۔ اور اپنے مطابق پھر حدیثیں بھی وضع کرلی گئیں۔

قرآن سے لونڈی غلام بنانے کی اجازت قرآن کی جس آیت کا ایک ٹکڑا اوپر مذکور ہوا، اُس کی پوری آیت سورہ محمدؐ میں یوں ہے: وَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ ۙ فَاِمَّا مَنًّاۢ بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا

یعنی جب (اے مسلمانو!) تم سے اور کفار سے (بحالتِ جنگ) مڈبھیڑ ہو تو (خوب) گردنیں مارو، یہاں تک کہ تم قتال کر کے انہیں مغلوب کرلو تو پھر (بقیۃ السیف کو) مضبوط باندھ لو۔ اس کے بعد (ان قیدیوں کو) یا تو احساناً چھوڑ دو، یا اُن سے فدیہ وصول کرلو (یہ حکمِ قتال اور بقیۃ السیف کو قید کر لینے کا حکم اُس وقت تک باقی رہے گا)، جب تک جنگ اپنے ہتھیار رکھ نہ دے (یعنی کفار کی جماعت جنگ سے جب باز آجائے اور صلح پر آمادہ ہو جائے، پھر صلح کرے تو حکمِ قتال و قید باقی نہیں رہے گا۔ یہ حکم صرف جنگجو کفار کے لیے ہے)۔

غرض قیدیوں کو احساناً چھوڑ دینے کا ذکر چوں کہ پہلے ہے اس لیے سب سے بہتر یہی ہے کہ جب کفار مغلوب ہو چکے تو اُن کے قیدیوں کو احساناً چھوڑ دیا جائے تاکہ اسلامی حسن اخلاق کا اُن پر اچھا اثر پڑے۔

مگر ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ صرف ایک جماعت سے مڈبھیڑ ہوئی اور یہ مغلوب ہوئی، بہت سے مارے گئے، باقی قید ہوئے، لیکن ابھی ان کی متعدد جماعتیں یا ایک ہی بڑی جماعت موجود ہے۔ یہ قیدی اور ان کی دوسری جماعتیں فطرةً بھی بدنہاد اور شورہ پشت و احسان فراموش ہیں۔ اگر ان قیدیوں کو احساناً چھوڑ دیا گیا تو یہ اس احسان کی شکر گذاری ہرگز نہیں کریں گے، بلکہ اپنی دوسری جماعتوں کے ساتھ مل کر پھر حملہ آور ہوں گے، جیسا کہ عموماً ہوا کرتا ہے۔ کیوں کہ صرف احساناً چھوڑ دینے سے یہ اپنے مقتولین اور مال و اسباب جو غنیمت میں اُن سے چھینا گیا، سب کا غم بھول جائیں اور اُن کے دلوں میں جذبۂ انتقام باقی نہ رہے، یہ مشکل ہے۔ یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ اُن کی کوئی دوسری جماعت معین و مددگار نہ ہو۔ اور یہ اپنی پوری طاقت سے حملہ آور ہوئے ہوں اور اب شکست کھا جانے کے بعد ان میں دوبارہ طاقت بہم پہنچا کر انتقام لینے کی مطلق صلاحیت نہ رہی ہو، تو یہی ایک صورت ہے کہ وہ اس احسان کو غنیمت سمجھیں گے کہ جان بچی لاکھوں پائے۔

اس لیے اگر یہ خطرہ باقی ہو کہ یہ دوبارہ طاقت بہم پہنچا کر حملہ آور ہو سکتے ہیں اور دوسری جماعتوں سے مل کر اپنی طاقت بڑھا سکتے ہیں تو پھر فدیہ وصول کرنے کا اختیار بھی مسلمانوں کو دیا گیا۔

تو جس موقع پر امیر لشکر مسلمین نے قیدی کافروں کو احساناً چھوڑ دینے کو خلاف مصلحت سمجھا اور اُن سے فدیہ کا مطالبہ کیا۔ اگر یہ فدیہ نہ دیں تو کیا پھر اِمَّا مَنًّا یعنی احساناً چھوڑ دینے کا حکم ان پر لامحالہ عائد ہو جائے گا؟ اور یہ احساناً چھوڑ دینے پر مجبور ہو جائیں گے؟ ایسا ہرگز نہیں ہے، کیوں کہ اگر ایسا ہے، تو پھر اِمَّا فِدَآءً کا حکم محض لغو اور فضول ٹھہر جاتا ہے۔ جب کفار کو اس کی اطلاع ہو جائے گی کہ ان کے ہاں یہی دو حکم ہیں، یا احساناً

چھوڑ دیا جائے یا فدیہ لے کر، تو اگر ہم فدیہ نہ دیں گے تو آخر یہ احساناً ہی چھوڑ دینے پر مجبور ہو جائیں گے، اس لیے ممکن نہیں کہ کوئی بھی کافر قیدی فدیہ ادا کرنے کی طرف مائل ہو۔

اس لیے فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً سے صاف ظاہر ہے کہ جس طرح احساناً چھوڑ دینا مسلمانوں کے اختیار میں ہے، اسی طرح فدیہ وصول کرنا بھی مسلمانوں کے اختیار میں ہے۔ جس موقع پر محض احساناً چھوڑ دینا مسلمانوں کے نزدیک خلاف مصلحت ہے، وہاں وہ کافر قیدیوں کو فدیہ ادا کرنے پر مجبور کریں گے۔ جب تک وہ فدیہ ادا نہ کریں، اس وقت تک فَشُدُّوا الْوَثَاقَ کا حکم علیٰ حالہ باقی رہے گا۔ وہ سارے قیدی مرد ہوں یا عورتیں، بوڑھے ہوں یا بچے، قیدی ہی کی حالت میں شد وثاق کے ساتھ مسلمانوں کے قبضہ میں رہیں گے اور سب کے سب اپنے زرِ فدیہ میں گرو رہیں گے۔ اسی گرو رہنے کو حسب اصطلاح قدیم لونڈی غلام بننا کہا جاتا ہے۔

مگر جنگ ختم ہونے کے بعد جو اس معرکے کے سارے مسلمان ان قیدیوں کو گھر واپس لائیں گے، تو آخر ان کے رہنے سہنے، کھانے پینے کا کوئی انتظام تو ضرور کرنا ہوگا۔ اس لیے مالِ غنیمت جس طرح تقسیم ہوگا، اسی طرح ان لوگوں کے ذمے جو زرِ فدیہ ہے، وہ بھی ان مجاہدین میں ضرور تقسیم ہوگا۔ اگر زرِ فدیہ تقسیم مالِ غنیمت سے پہلے وصول ہو جائے گا تو پھر یہ قیدی تو آزاد ہو جائیں گے اور زرِ فدیہ ہی تقسیم ہوگا۔ ورنہ زرِ فدیہ کے عوض وہ قیدی ہی ایک ایک مجاہد کو ایک ایک یا زیادہ یا کئی مجاہدین میں ایک قیدی، مجاہدین اور قیدیوں کی تعداد کے مطابق حسب موقع و محل و استحقاق تقسیم ہو جائیں گے۔ جس کو جس قیدی کا زرِ فدیہ نہ ملا، وہ قیدی اس مجاہد کے ہاں گرو ہے۔ اب اس کا کھانا پینا رہنا سہنا اس مجاہد کے ذمے ہے، جو خود کھائے گا، اسے کھلائے گا اور جو خود پہنے گا، اسے پہنائے گا۔ پوری مساوات کا برتاؤ کرے گا، کیوں کہ وہ قیدی ہے، اسی وقت تک جب تک کہ زرِ فدیہ ادا نہ کر دے[1]۔ پھر اگر مسلمان ہو گیا تو دینی بھائی بھی ہے۔ اس حسن سلوک اور مساوات کا اس پر اچھا اثر پڑ سکتا ہے اور اس سے متاثر ہو کر وہ اسلام قبول کر لے سکتا ہے، مگر اسلام لانے کے بعد بھی وہ قیدی ہی ہے[2]، اگر اس کو آزاد کر دیا جائے اور زرِ فدیہ معاف کر دیا جائے تو بہت بہتر ہے مگر اس پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے کہ وہ زرِ فدیہ اس کو مالِ غنیمت میں ملا ہے۔ اگر اس کو مجبور کیا گیا کہ فدیہ معاف کر کے آزاد کر دو تو اس کا حصۂ مالِ غنیمت چھا ہو جاتا ہے۔

اب اس قیدی کو باصطلاح قدیم غلام یا لونڈی کہا جاتا ہے، مگر یہ حسب دستورِ قدیم غلام یا لونڈی نہیں ہے، بلکہ گھر کا ایک سوانگ[3] اور اپنا ایک خاص عزیز ہے۔ البتہ گھر کا ضروری کام جس طرح اپنے عزیزوں سے لیا جاتا ہے، خود کرتے ہیں، بالکل اسی انداز سے اسی طرح اس سے بھی لیا جائے گا۔ اس سے مزدوری کرا کے اس کی حیثیت کے مطابق پیسہ کمایا جا سکتا ہے، جو کچھ وہ کمائے اس میں سے وہ مجاہد جس کے حصہ میں اس کا زرِ فدیہ پڑا ہے اور جس کے ہاں یہ گرو ہے، اور اب حسب اصطلاح قدیم اس کا مولیٰ اور آقا ہے، حسب ضرورت لے سکتا ہے جس طرح اپنے عزیزوں کے مال میں سے لے سکتا ہے۔

---

[1] یعنی تقسیم کے بعد بھی اِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً کا حکم باقی ہے، اس لیے کہ یہ تقسیم اسی شدوا الوثاق کے ماتحت ہوتی ہے۔ جنگ ہوازن میں رسول اللہ صلعم نے ان قیدیوں کو تقسیم کے بعد ان کی قوم کی درخواست پر محض احساناً چھوڑ دیا تھا۔ چوں کہ احساناً چھوڑوانا تھا، اس لیے آپ نے مسلمانوں سے احساناً چھوڑ دینے کی سفارش کی۔ اگر فدیہ لے کر ان قیدیوں کی قوم آتی تو سفارش کی بھی ضرورت نہ تھی، چھوڑ دینا ہی پڑتا۔ بخاری میں اس کا مفصل ذکر ہے۔ ۱۲ منہ

[2] بعض عزیزوں نے فرمایا کہ اگرچہ کسی دلیل کی بنا پر نہیں مگر صرف وجدان کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ اسلام لانے کے بعد اس کو آزاد ہو جانا چاہیے۔ چاہے تقسیم سے پہلے ہو چاہے تقسیم کے بعد۔ اور تقسیم سے پہلے تو خاص کر کے۔ اس میں شک نہیں کہ میرا دل بھی یہی چاہتا ہے، مگر اس کی دلیل مجھے قرآن کی کسی آیت سے نہیں ملتی۔ اس کے علاوہ اس میں فتنہ بھی ہے۔ سارے قیدی فریب دے کر آزادی حاصل کرنے کے لیے محض منافقانہ اسلام قبول کر کے طرح طرح کے فتنے بپا کر سکتے ہیں۔ بے شک جزیہ دینے کے خوف سے بہتیرے ذمی کفار بھی اسلام لے آیا کرتے تھے، مگر وہ ذمی ہونے کی وجہ سے زیادہ خطرناک نہ تھے اور یہ تو محارب تھے۔ شکست کھا کر مغلوب و اسیر ہونے کے بعد جذبۂ انتقام ان کے دل میں زیادہ ہوگا۔ غلام بنا لیے جانے سے ان کے دلوں میں اور بھی غصہ بھرا ہوگا، ان سے خطرے زیادہ محسوس ہونے چاہییں۔ لہٰذا ان کے اسلام قبول کر لینے سے دھوکا کھا کر شدوا الوثاق سے ان کو آزاد کر دینا بغیر اطمینان حاصل کیے صحیح نہ ہوگا۔ اس کے لیے از روئے قرآن احساناً چھوڑ دینے کا حکم تو اس وقت بھی باقی ہی ہے مگر اختیاری طور سے استحباباً۔ ۱۲ منہ

[3] فرد کا رکن" (کما صرح بہ کاتبہ فی بعض مکاتیبہ نفعنا اللہ لعلمہ وفضلہ) مدیر

مال العبد مال المولیٰ یہ زمانہ جاہلیت کی رسم تھی کہ لونڈی غلام خود کسی چیز کے مالک نہیں ہو سکتے، اُن کی ساری کمائی اُن کے آقاؤں کی مِلک سمجھی جاتی تھی۔ ان کی حیثیت جانوروں کی سی تھی۔ جس طرح اونٹ، گھوڑے، بیل کی محنت کی مزدوری ان کے مالک کی مِلک ہوتی ہے۔ اونٹ، گھوڑے، بیل کا اُس میں کوئی حصہ نہیں ہوتا، بجز اس کے کہ اُن کا مالک اُن کو مناسب طرح سے کھلایا کرے کہ وہ خوب مزدوری کمانے کے قابل بنے رہیں، بالکل اسی طرح یہ انسان بھی جو صرف زرِ فدیہ ادا نہ کر سکنے کی وجہ سے ان کی قید میں پڑ گئے ہیں، ان کے نزدیک اونٹ، گھوڑے اور بیل کی طرح حیوان ہی ہیں کہ ان کی محنت مزدوری میں خود اُن کا کوئی حصہ نہیں۔

قرآن سے اس کی کوئی سند نہیں اور نہ ہرگز قرآن ایسی ظالمانہ رسم کو ایک منٹ کے لیے بھی روا رکھ سکتا ہے۔ اسلام اور اسلام کے رسول صلعم جو رحمۃ للعالمین تھے، وہ کبھی ایسی ظالمانہ رسم کو جائز نہیں رکھ سکتے تھے، خصوصاً جس کا حق قرآن سے کسی طرح بھی ثابت نہیں ہوتا۔ مگر افسوس کہ بعد والوں نے جاہلیت کی اُس ظالمانہ رسم کو پھر سے زندہ کرکے اس کو اسلامی قانون کی دفعہ بنا کر کتابوں میں درج کردیا۔ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ بِھَا مِنْ سُلْطٰنٍ۔

سورہ نحل کی ایک آیت اس کی دلیل میں پیش کی جاتی ہے، ارشاد ہے: ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّمَنْ رَّزَقْنٰهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا فَهُوَ يُنْفِقُ مِنْهُ سِرًّا وَّجَهْرًا ۭ هَلْ يَسْتَوٗنَ ۝ یعنی اللہ تعالیٰ مثال پیش فرماتا ہے ایک ایسے بندۂ مملوک کی، جو کسی چیز پر قدرت نہیں رکھتا اور اُس کی جس کو (اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ) ہم نے اُسے عمدہ رزق روزی کیا ہے، تو وہ اس عمدہ رزق میں سے (اللہ کی راہ میں) ظاہراً اور پوشیدہ (ہر طرح سے) خرچ کرتا ہے۔ کیا دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ اس آیت سے یہ مطلب نکالا گیا کہ بندہ مملوک کسی چیز کا مالک نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ لَا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ کا لفظ یہاں آیا ہے۔ حالانکہ اس کا ترجمہ ہرگز یہ نہیں کہ وہ کسی چیز کا مالک نہیں ہو سکتا، بلکہ اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ اپنے اختیار سے کچھ نہیں کرسکتا، یعنی آقا کے گھر سے باہر نہیں جا سکتا۔ اپنی برادری والوں سے جا کر مل نہیں سکتا۔ اگر اُس کے گھر اس کے بال بچے ہیں تو اُن سے نہیں مل سکتا۔ اگر وہ خود کمانا چاہے تو آقا کی اجازت کے بغیر مزدوری نہیں کرسکتا۔ شادی کرنا چاہے تو آقا کی اجازت ہی سے کرسکتا ہے۔ غرض وہ اپنی ذاتی ضرورتوں میں سے بھی بہتیری ضرورتوں میں اپنے آقا کی اجازت کا محتاج ہے۔

اس کے علاوہ اس آیت سے تو یہ ثابت ہی نہیں ہوتا ہے کہ ہر عبد مملوک لایقدر علیٰ شیءٍ ہوتا ہے، بلکہ ایسے عبد مملوک کی مثال پیش کی گئی ہے جو لایقدر علیٰ شیءٍ ہو۔ مثلاً وہ اندھا بھی ہو، گونگا بہرا بھی ہو، لولا بھی ہو، کہ اُس کو کسی کام کی بھی صلاحیت نہ ہو۔ اپنی ہر ضرورت اور ہر کام میں وہ دوسرے کا محتاج ہو۔ ایک طرف ایک ایسا مجبور غلام ہے اور دوسری طرف مَنْ رَّزَقْنٰهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا ہے۔ اس لیے یہ تو کسی طرح بھی ثابت نہیں ہوتا کہ ہر بندہ مملوک لایقدر علیٰ شیءٍ ہوا کرتا ہے۔

”عبد“ کے ساتھ ”مملوک“ کا لفظ اس لیے لایا گیا کہ اللہ تعالیٰ کے تو سب ہی ”عبد“ ہیں، ایسا نہ ہو کہ یہاں ”عبد“ سے اللہ تعالیٰ کے بندے مراد لے لیے جائیں۔ ”مملوک“ کی قید نے بتا دیا کہ یہاں ”عبد“ سے وہ اصطلاح عرفِ عام والا ”عبد“ مراد ہے۔ اس کے بعد اس کی مزید معذوری بیان کردی کہ بندہ مملوک بھی ایسا جس کو کسی کام کی بھی قدرت نہ ہو۔ ورنہ تاریخ شاہد ہے کہ اسلامی ترقیوں کے دور میں غلاموں نے غلامی کی حالت میں بھی کیا کچھ نہیں کیا ہے تو کیا وہ باوجود عبد مملوک ہونے کے لایقدر علیٰ شیءٍ کے مصداق تھے؟ عکرمۃ البربری ابو عبداللہ المدنی، جن کو مولیٰ ابن عباس کہا جاتا ہے اور جن کو اُن کے ہم عصر حَبْرُ ھٰذِہِ الْاُمَّۃِ (عالمِ اُمت) کہا کرتے تھے، غلام ہی تھے۔ اگرچہ مولیٰ غلام آزاد کردہ کو کہتے ہیں، مگر عبداللہ بن عباس نے تا زندگی اُن کو آزاد نہیں کیا۔ چنانچہ ابن حجر عسقلانی، تہذیب التہذیب میں یحییٰ بن معین کا قول نقل کرتے ہیں: قال عباس الدوری عن یحییٰ بن معین مات ابن عباس وعکرمۃ عبد لم یعتقہ۔ فباعہ علی بن عبداللہ بن عباس ثم استردہ وفی روایۃ غیرہ واعتقہ۔ یعنی عباس دوری یحییٰ بن معین سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباس جب فوت ہوئے تو عکرمہ غلام ہی تھے۔ اُنہوں نے ان کو آزاد نہیں کیا تھا۔ پھر عبداللہ بن عباس کے بیٹے علی نے اُن کو بیچ ڈالا۔ پھر واپس لے لیا۔ یحییٰ بن معین کے علاوہ دوسری روایت سے یہ بھی ثابت

ہے کہ علی بن عبداللہ بن عباس نے جو بیچ ڈالنے کے بعد پھر اُن کو واپس لے لیا، تو آزاد کردیا۔ غرض عکرمہ حضرت عبداللہ بن عباس کے زمانے ہی میں بہت بڑے مفتی تھے۔ یہ کیوں کر کہا جا سکتا ہے کہ مملوک ہونے کی وجہ سے یہ لا یقدر علیٰ شئ تھے۔

غرض اس آیت سے یہ مطلب کسی طرح نہیں نکلتا کہ غلام کسی چیز کا مالک نہیں ہو سکتا اور اُس کا سارا مال اُس کے آقا کا مال ہو جائے گا۔ اس آیت سے "مال العبد مال المولیٰ" کا ظالمانہ مفہوم نکالنا درحقیقت قرآن پر ظلم کرنا ہے۔

مال العبد مال المولیٰ کے غلط ہونے کی قرآن ہی سے ایک اور دلیل

یہ تو معلوم ہو چکا کہ قرآن کی رُو سے یہ لونڈی غلام سب ایسے قیدی ہیں، جو اپنے فدیہ میں گِرو ہیں۔ جس وقت بھی یہ زرِ فدیہ ادا کردیں، آزاد ہو جائیں گے۔ اس لیے ان کو اس قدر اپنے ذاتی کاموں میں مصروف و مشغول رکھنا کہ یہ بے چارے کسی طرح بھی کچھ کما کر زرِ فدیہ ادا نہ کرسکیں، اُنھیں اس کا موقع ہی نہ دینا اُن کے آقاؤں کے لیے کبھی جائز نہیں ہو سکتا، اس لیے اگر یہ مزدوری کر کے، کوئی پیشہ اختیار کر کے کمانا چاہیں تو ضرور اُنھیں اس کا موقع دینا چاہیے۔ یا اگر کسی دوسرے سے قرض لے کر اپنا زرِ فدیہ ادا کردیں اور پھر تھوڑا تھوڑا کما کر اپنے مہاجن کا قرض ادا کردیں، تو وہ ضرور ایسا کرسکتے ہیں۔ آقا کو زرِ فدیہ لے لینے میں کسی طرح کا بھی عذر نہیں کرنا چاہیے اور نہ عنداللہ اس میں کوئی عذر مسموع ہو سکتا ہے۔ البتہ زرِ فدیہ کی مقدارِ مناسب کی تعیین دو چار منصف مسلمان کردیں گے یا قاضی شرع کردے گا، جس کو قبول کرنا ہوگا، آقا کو بھی، غلام کو بھی۔ غلام کچھ کما کر زیادہ دے دے، تو اُس کا احسان ہے، آقا کچھ معاف کردے، تو اُس کا احسان ہے۔ وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ۔

مگر ظاہر ہے کہ ایک قیدی غریب جو اپنے اعزّہ و اقران سے دُور غلامی کی زندگی بسر کر رہا ہے، اُس کے پاس یکمشت اتنی رقم کہاں سے آسکتی ہے کہ وہ بیک دفعہ پورا فدیہ ادا کردے اور دوسرا شخص کس بھروسہ پر اُس کو ایک بڑی رقم دے دے گا کہ وہ یکمشت فدیہ ادا کرسکے اور پھر توڑ توڑ کر تھوڑا تھوڑا ایک مدت میں وہ رقم وصول کرلے؟

مکاتبت کا حق اور حکم

اس لیے اللہ تعالیٰ نے ایک صورت اور نکال دی کہ خود آقا ہی سے وہ درخواست کرے کہ آپ مجھ کو اس کی اجازت دیں کہ چند اقساط میں تھوڑا تھوڑا کما کما کر اتنی مدت میں آپ کو اپنا زرِ فدیہ ادا کردوں۔ اگر کوئی غلام یا لونڈی ایسا چاہے، تو آقا سے کہا گیا کہ وہ اس کو اس کا موقع دے اور اس شرط کو قبول کرلے۔ اسی کو "مکاتب کرنا" اور "مکاتبت" کہتے ہیں اور کبھی "کتاب" کا لفظ بھی اس کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ چوں کہ عموماً اس کے لیے آقا اور غلام کے درمیان اس رقم کے ادا کرنے کی شرطیں اور اقساط اور مدت وغیرہ کے متعلق ایک معاہدہ پہلے لکھ لیا جاتا تھا، جس پر کچھ لوگوں کی شہادتیں بھی ہوتی تھیں۔ یہ رسم اسلام سے پہلے بھی تھی۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس کی اجازت صرف اسلام ہی نے دی ہے، غلط ہے۔ قرآن کی آیت خود بتا رہی ہے کہ یہ ایک متعارف اور مشہور اصطلاح پہلے سے قائم تھی۔ البتہ پہلے آقا کی خوشی پر موقوف تھا کہ مکاتب کرے یا نہ کرے، قرآن نے آقا پر فرض کردیا کہ اگر لونڈی یا غلام ایمان لا چکے ہوں اور مکاتبت کی درخواست کریں تو تم مکاتب کردو۔ مگر یہاں بھی لوگوں نے پھر جاہلیت کی رسم کو تازہ کردیا ہے کہ قرآن کے اس حکم کو الامر للوجوب کے اصول کے خلاف بلا دلیل محض جواز و استحباب کے لیے قرار دیا ہے۔ آیت یہ ہے: والذین یبتغون الکتٰب مما ملکت ایدیکم فکاتبوھم ان علمتم فیھم خیراً و اٰتوھم من مال اللہ الذی اٰتٰکم۔ یعنی، تمہارے ملک یمین میں سے جو لوگ تم سے مکاتبت چاہیں، تم اگر اُن میں ایمان محسوس کرو تو اُن کو مکاتب کردو اور اللہ تعالیٰ نے جو اپنا مال تمہیں دیا ہے اُس میں سے اُن کو دو (کہ وہ اس سے زرِ کتابت ادا کرسکیں) (سورہ نور آیت ۳۳)

اس آیت میں صرف ایک شرط ضرور ہے، ان علمتم فیھم خیرا۔ لفظی ترجمہ اس کا یہ ہے کہ "اگر تم کو اُن میں خیر ہونے کا علم ہو"۔ "خیر" کے معنی بھلائی کے ہیں۔ محاورے میں "مال" کے معنی بھی لیے جاتے ہیں۔ وصیت کی آیت میں ہے: ان ترک خیرا، جس کا ترجمہ بالاتفاق یہی ہے کہ "اگر مال چھوڑ جائے"۔ مگر تھوڑے مال اور حرام مال کو خیر نہیں کہتے، زیادہ مال اور حلال مال کو خیر کہتے ہیں، اسی لیے بعض مفسرین نے یہاں بھی "خیر" سے مراد "مال"

ہی لیا ہے، یعنی، اگر تمہیں اس کا علم ہو جائے کہ ان کے پاس اتنا مال ہے کیو زرِ کتابت ادا کر دیں گے، مگر چوں کہ یہ معنی ان کے مسلمہ اصول کے خلاف ہوتے تھے، یعنی، اگر اس کے پاس مال ہے، تو وہ تو مال العبد مال المولیٰ کے رو سے آقا کی مِلک ہو گیا۔ اس کے پاس مال آیا کہاں سے اور رہا کہاں۔ اس لیے مطلب اس آیت کا یہ لگایا کہ اگر تم کو یہ علم ہو کہ یہ کمانے کی صلاحیت رکھتا ہے اور خیر یعنی مال کثیر و حلال حاصل کر سکتا ہے"۔ تو اگر ایسا ہو تو اُس کو اس کی اجازت دے دو اور مکاتب کر دو اور اس معنی کے لیے ایک روایت بھی جو اسی آیت کی تفسیر میں علامہ ابن کثیر نے لکھی ہے پیش کرتے ہیں: عن موسیٰ بن انس اَنَّ سیرِیْنَ سَئَلَ انسًا اَلْمُکَاتَبَۃَ وکان کثیرَ المال فَاَبٰی۔ فَانْطَلَقَ اِلٰی عُمَرؓ۔ فقال کَاتِبْہُ۔ فَاَبٰی فَضَرَبَہٗ بِالدِّرَّۃِ وَیَتْلُوْ عُمَرُؓ۔ فَکَاتِبُوْھُمْ اِنْ عَلِمْتُمْ فِیْھِمْ خَیْرًا فکاتبہٗ ھکذا۔ ذکرہ البخاری۔ یعنی حضرت انس کے بیٹے موسیٰ سے روایت ہے کہ سیرین (محمد بن سیرین مشہور تابعی کے والد، جو حضرت انس کے غلام تھے) اُنہوں نے حضرت انس سے مکاتبت کی درخواست کی اور سیرین بڑے مال دار تھے، تو حضرت انس نے انکار کیا، تو سیرین حضرت فاروق اعظم امیر المومنین عمرؓ کے پاس فریاد لے گئے، تو حضرت امیر المومنینؓ نے حضرت انس سے کہا کہ ان کو مکاتب کر دو۔ (یہاں بھی) حضرت انس نے انکار کیا تو حضرت امیر المومنینؓ نے حضرت انس کو یہ آیت تلاوت کرتے ہوئے کہ فکاتبوھم ان علمتم فیھم خیرا، دِرّے سے مارا۔ یہ روایت بخاری میں اسی طرح ہے۔

مَیں تو اس مضمون میں اپنے ارادے کے مطابق صرف قرآنی آیتیں ہی پیش کروں گا۔ مگر چوں کہ فریق کی طرف سے یہ روایت تفسیر میں پیش کی جاتی ہے اس لیے اگر فریق کی دلیل سے میرا مطلب نکل آئے تو یہ زائد نفع ہے۔

سیرین باوجود غلام ہونے کے کثیر المال تھے۔ اس سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ اُس وقت مال العبد مال المولیٰ کی رسم نہ تھی، ورنہ سیرین کا سب مال حضرت انس کے قبضے میں ہوتا اور سیرین کو کثیر المال نہ کہا جاتا۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وکان کثیر المال سے مراد سیرین نہیں ہیں بلکہ حضرت انس ہیں۔ حضرت انس کثیر المال تھے اس لیے اُن کو زرِ کتابت کی ضرورت نہ تھی۔ اسی لیے اُنھوں نے مکاتبت سے انکار کیا۔ یہ نہیں کہا جا سکتا۔ کیوں کہ یہ روایت اسی ثبوت میں پیش کی گئی ہے کہ سیرین کے پاس خیر یعنی مال کثیر تھا اور اس کو ان علمتم فیھم خیرا کی تفسیر میں پیش کیا گیا ہے۔ اسی لیے امام بخاری اور ابن کثیر وغیرہما نے بھی اس سے یہی معنی لیے ہیں کہ سیرین کے پاس مال کثیر تھا۔ ان علمتم فیھم خیرا کے وہ مصداق تھے۔ پھر حضرت امیر المومنین فاروق اعظمؓ نے بھی حضرت انس کو دِرّہ لگاتے ہوئے آیت کے اس ٹکڑے کو دُہرایا کہ فکاتبوھم ان علمتم فیھم خیرا۔ اسی ثبوت میں اس کو پیش کیا گیا ہے، اس لیے مال العبد مال المولیٰ کا اصول بالکل غلط ہے اور عہد خلفائے راشدین تک اس کا رواج نہ تھا۔

دوسری بات اس سے یہ ثابت ہوئی کہ حضرت انس قبل اسلام کے رواج کے مطابق مکاتب کرنے کو ایک فعل مستحب ہی سمجھتے تھے۔ مگر حضرت فاروق اعظمؓ اس کو فرض سمجھتے تھے، ورنہ وہ سفارش کرتے، دِرّہ نہ مارتے۔ ایک فعل مستحب کے ترک پر دِرّہ مارنے کی کوئی وجہ نہ تھی، مگر وہ فعلِ فرض کا ترک سمجھ رہے تھے، اسی لیے دِرّے لگائے۔

مگر مفسرین کی ایک جماعت کثیر خیرًا کے معنی یہاں "ایمان" کہتی ہے اور میرے نزدیک یہی صحیح ہے۔ کیوں کہ اگر مِلک یمین کے پاس مال کثیر بروقت موجود یا آئندہ حاصل کر لینے کی اُمید پر مکاتب کرنا مشروط ہوتا تو پھر ادائے زرِ کتابت میں مال زکوٰۃ و صدقات سے ان کی مدد کرنے کو نہ کہا جاتا یعنی، اس کے آگے واٰتوھم من مال اللہ الذی اٰتٰکم نہ کہا جاتا۔ اس لیے یقیناً یہاں خیر سے ایمان ہی مراد ہے۔ دوسری دلیل یہ بھی ہے کہ مال اللہ سے امداد اسی شخص کی ہو سکتی ہے اور وہی اس کا مستحق ہو سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتا ہو، اُس کے رسول، اُس کی کتاب اور اُس کے دین کو مانتا ہو۔ جو شخص کہ اللہ، اللہ کے رسول، اللہ کی کتاب اور اللہ کے دین کا منکر ہے، اُس کو اللہ کے مال سے فائدہ اُٹھانے کا بھی کوئی حق نہیں۔ پھر "خیر" کا لفظ "ایمان" کے معنی میں مستعمل بھی ہے، جیسا کہ سورہ انفال رکوع ۱۰ میں ہے: اِنْ یَّعْلَمِ اللّٰہُ فِیْ قُلُوْبِکُمْ خَیْرًا یُّؤْتِکُمْ

خَیْرًا مِّمَّآ اُخِذَ مِنْکُمْ وَیَغْفِرْ لَکُمْ ط حسنِ اتفاق دیکھیے کہ یہ آیت بھی انہیں قیدیوں ہی کے متعلق نازل ہوئی ہے اور انہیں کو مَنْ فِیْٓ اَیْدِیْکُمْ مِّنَ الْاَسْرٰٓی فرمایا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر قیدی فدیہ دیں تو فدیہ لے کر ورنہ احساناً چھوڑ ہی دینے کا حکم ہوتا، تو پھر مسلمانوں کے ہاتھ میں قیدی نہ ہوتے۔ اور یہاں کہا جارہا ہے کہ یاایھا النبی قل لمن فی ایدیکم من الاسریٰ ان یعلم اللہ فی قلوبکم خیرًا یؤتکم خیرا مما اخذ منکم ویغفر لکم۔ یعنی اے رسول تم لوگوں کے ہاتھوں میں جو قیدیوں میں سے ہیں، اُن سے کہہ دو کہ اگر اللہ تعالیٰ نے تمہارے قلوب میں خیر یعنی ایمان جان لیا، تو جو کچھ تم سے لیا گیا ہے (مال غنیمت میں) اُس سے بہتر تمہیں دے گا اور تمہیں بخش بھی دے گا۔ دیکھیے، یہاں صاف انہیں غلاموں کے متعلق خیر کا لفظ بالاتفاق "ایمان" کے معنی میں ہے، اور یہ بھی صاف بتادیا کہ یہ غلام درحقیقت قیدی ہیں، تمہارے قبضے میں ہیں، تو یہ تمہارے گھروں میں وہ سارا مال واسباب جو کبھی اُن کی مِلک تھا، دیکھیں گے تو یقیناً اُن کے دلوں کو دُکھ ہوگا اور یہ بھی ممکن ہے کہ غصہ اور جذبۂ انتقام پیدا ہو۔ پس اُن سے یہ کہہ دینا، ان کی تسلی کے لیے ضروری تھا کہ تم گھبراؤ نہیں۔ دیکھو ہمیں بھی جو یہ مال ملا ہے تو ایمان کی برکت سے ملا ہے، تم بھی ایمان لے آؤ، تو یہی برکت تم کو بھی حاصل ہوسکتی ہے، مگر صرف منافقانہ طور پر اپنے آپ کو مسلمان کہنے یا دکھانے سے برکت نہیں حاصل ہوسکتی، بلکہ دل سے ایمان لاؤ۔ اصل برکت دینے والا تو اللہ تعالیٰ ہے، جب وہ تمہارے دلوں میں ایمان دیکھ لے گا تو ضرور تم کو اُس سے بھی اچھا دے گا، جو تم سے لیا گیا ہے اور پھر تمہارے گناہوں سے بھی درگذر فرمائے گا، تو یہ آیت پوری وضاحت سے بتا رہی ہے کہ وہاں بھی ان علمتم فیھم خیرًا سے مراد "ایمان" ہی ہے، اسی لیے ترجمے میں مَیں نے خیر کا معنی "ایمان" ہی لکھا۔

غرض مکاتبت والی آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر غلام کافر ہو، یعنی، غیر مسلم ہو، تو آقا کو اختیار ہے، چاہے مکاتبت کرے یا نہ کرے، مگر پھر بھی مکاتب کردینا بہتر ہے اور اگر غلام ایمان لاچکا ہے اور ارکان اسلام بجا لارہا ہے، تو اگر وہ مکاتبت کی درخواست کرے، تو آقا پر مکاتب کردینا فرض ہے اور اگر وہ زرِ کتابت ادا نہ کرسکے تو مال زکوٰۃ سے، عام خیرات سے اس کی مدد کی جائے گی، اور یہ امداد بھی زکوٰۃ دینے والوں پر فرض ہوگی کیونکہ اس کا بھی حکم اس آیت موجود ہے، مگر واضح رہے کہ کتابت کا حکم باقساط ہی ادا کرنے کے متعلق ہے۔ اس لیے کہ مکاتبت کی یہی اصطلاح متعارف تھی۔ یکمشت اگر کوئی غلام یا لونڈی مسلم ہو، یا غیر مسلم، اپنا زرِ فدیہ ادا کردے، تو اُس کے لینے سے انکار کرنے کا کوئی حق کسی آقا کو نہیں ہے۔ کیوں کہ شدّوا الوثاق کا حکم بس اُسی وقت تک ہے، جب تک کہ وہ فدیہ ادا نہ کریں۔ جب وہ فدیہ ادا کررہے ہیں، تو پھر شدِ وثاق جائز نہیں۔ البتہ زرفدیہ اگر کم ہے تو اس کا تصفیہ امیر یا قاضی، یا دو چار حکم کردے سکتے ہیں۔ اگر وہ اُن کے فیصلے سے کم زرفدیہ ادا کرے، جب البتہ وہ قلیل رقم قبول نہ کی جائے گی اور شدوثاق کا حکم باقی رہے گا، تاہم وہ رقم قلیل قبول کرلی جائے، تو از روئے حکم احسان بہتر ہے۔

مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ کے صحیح معنی

ابھی جو مَیں نے سورہ انفال کی آیت نقل کی: یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ قُلْ لِّمَنْ فِیْٓ اَیْدِیْکُمْ مِّنَ الْاَسْرٰٓی۔ اس سے مَیں یہ ثابت کرچکا کہ مِلکِ یمین کی حیثیت صرف ایک قیدی کی ہے۔ اس آیت سے پہلے بھی یہیں پر ارشاد ہے کہ مَا کَانَ لِنَبِیٍّ اَنْ یَّکُوْنَ لَہٗٓ اَسْرٰی حَتّٰی یُثْخِنَ فِی الْاَرْضِ۔ یعنی جب تک کافی خون ریزی کے ذریعہ غلبہ حاصل نہ کرلیا جائے، اپنی دھاک نہ بٹھادی جائے، اُس وقت تک کسی نبی کے لیے یہ مناسب نہیں ہے کہ اس کے لیے قیدی (لونڈی غلام کی صورت میں) مہیا کیے جائیں۔ اَنْ یَّکُوْنَ لَہٗٓ اَسْرٰی میں وہی لام تملیک ہے جو "مِلکِ یمین" کے مفہوم کو ظاہر کررہا ہے، یعنی، اُس کے پاس مِلکِ یمین کی حیثیت میں قیدی آئیں، یا لائے جائیں" یہ ایک بہت باریک نکتہ ہے جس کی طرف مفسرین کی نگاہ نہیں گئی۔ اگر یہ مفہوم اس میں پوشیدہ نہ ہوتا تو یَکُوْنَ لَہٗٓ اَسْرٰی نہ کہا جاتا بلکہ اَنْ یُّحْضَرَ عِنْدَہٗ اَسْرٰی وغیرہ کہا جاتا۔ قیدی قید ہونے کے ساتھ ہی ملک یمین ہو جاتے ہیں۔ مگر جب تک وہ مجاہدین میں تقسیم نہیں ہوتے، اُس وقت تک امیر جماعت مسلمہ کے مِلکِ یمین (امیر ہونے کی حیثیت سے، نہ کہ اُس کی ذات کی حیثیت سے) ہوتے ہیں۔ اسی لیے یہاں چوں کہ نبی صلعم ہی امیر تھے، اس لیے مَا کَانَ لِنَبِیٍّ اَنْ یَّکُوْنَ لَہٗٓ (بضمیر واحد) اَسْرٰی فرمایا گیا اور جب وہ تقسیم ہوگئے، تو پھر جو قیدی جس مجاہد کو ملا، اُسی کا "مِلکِ یمین" ہے اسی لیے

اس آیت میں جو پہلے مذکور ہوئی : یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ قُلْ لِّمَنْ فِیْٓ اَیْدِیْکُمْ (بضمیر جمع) مِّنَ الْاَسْرٰٓی فرمایا گیا۔ یہاں فی یدک یا فی یمینک (بضمیر واحد) نہیں فرمایا گیا۔ اس لیے کہ تقسیم کے بعد تو اب وہ جماعت مجاہدین کے ہاتھوں میں ہیں، نہ کہ صرف رسول کے ہاتھ میں۔ اس کی پوری تشریح لفظ "مِلکِ یمین" کے معنی میں ابھی آتی ہے۔

باقی رہا وہ جو مفسرین بعض روایات موضوعہ پیش کرتے ہیں کہ یہ آیت حضرت عباسؓ عم رسول اللہ صلعم کے متعلق اتری تھی، بالکل غلط ہے۔ اسریٰ "اسیر" کی جمع ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ صیغۂ جمع سے ایک شخص واحد سمجھا جائے۔ پھر اس کے بعد ہی جو ٹکڑا اسی سلسلۂ بیان کا ہے، وہ بھی بتا رہا ہے کہ عام اسیرانِ جنگ بدر کے بارے میں یہ ارشاد ہے۔ جن میں حضرت عباسؓ بھی تھے۔

اس کے بعد ہی ارشاد ہے کہ وان یریدوا خیانتک فقد خانوا اللہ من قبل فامکن منھم واللہ علیم حکیم ۝ یعنی اگر انہوں نے ایمان قبول نہ کیا، یا منافقانہ ایمان ظاہر کیا اور خیانت کا ارادہ دل میں پوشیدہ رکھتے رہے، پھر بھی تم نے ان کو حکم الٰہی فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ کے مطابق احساناً چھوڑ دیا، یا وَاِمَّا فِدَآءً کے مطابق فدیہ لے کر چھوڑا، یا اگر انھوں نے فدیہ بھی نہ دیا اور تم نے احساناً چھوڑنا بھی مناسب نہ سمجھا، تو واما فداء ہی کے مطابق ان کو فدیہ میں گرو رکھا اور جب تک یہ فدیہ ادا نہ کریں، اس وقت تک فشدوا الوثاق کے حکم کے مطابق ان کو قید رکھا اور یہ من فی ایدیکم اسریٰ کے مطابق مجاہدین کے پاس قیدی کی حیثیت سے رہے اور مِلکِ یمین بنے رہے اور تم ان کے ساتھ بالکل مساویانہ طرز معاشرت رکھتے ہوئے ہر ممکن حسن سلوک کے ساتھ پیش آتے رہے۔ غرض ان تمام صورتوں میں ان کے ساتھ رعایت ومروت واحسان وحسن سلوک ہی تم نے ملحوظ رکھا۔ اگر اس پر بھی خیانت کریں، تو یہ لوگ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ ہی کے ساتھ خیانت کر چکے ہیں، جس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ یہ مواخذہ کیا۔ اگر پھر خیانت کریں گے تو پھر سزا پائیں گے۔ ان پر قابو پا لینا کچھ مشکل تو ہے نہیں۔

تو وان یریدوا خیانتک کے فاعل وہی اسریٰ ہوں گے جو من فی ایدیکم من الاسریٰ میں مذکور ہیں۔ اس لیے صرف حضرت عباسؓ کو وہاں اسریٰ سے مراد لینا بہت زیادہ خلاف عبارۃ النص ہے اور من الاسریٰ سے حضرت عباسؓ پھر وان یریدوا سے عبداللہ بن سعد ابن ابی سرح کاتب مرتد کو مراد لینا مخالفت بالائے مخالفت ہے قرآن کی، عبارۃ النص اور سیاق وسباق کی۔

مِلکِ یمین کی اصطلاح کہا جاتا ہے کہ ہر چیز داہنے ہی ہاتھ سے خریدی جاتی ہے۔ میدان جنگ میں بھی داہنے ہی ہاتھ سے قتال کیا جاتا ہے اور مال غنیمت حاصل کیا جاتا ہے۔ یہ لونڈی غلام بھی خرید کر حاصل کیے جائیں، یا جہاد میں بطور مال غنیمت کے حاصل ہوں۔ داہنے ہی ہاتھ کی کمائی ہیں، اس لیے ان کو "مِلکِ یمین" اور "مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ" کہتے ہیں۔ حالانکہ یہ محض لغو اور بالکل بے بنیاد ہے۔ دنیا میں ہزاروں چیزیں خریدی جاتی ہیں مگر کسی چیز کو "مِلکِ یمین" نہیں کہتے۔ جہاد میں مال غنیمت طرح طرح کے حاصل ہوتے ہیں مگر کسی کو بھی "مِلکِ یمین" نہیں کہتے۔ صرف لونڈی غلام ہی کو کیوں کہتے ہیں؟ اگر قیاس مذکورۂ بالا صحیح ہوتا تو پھر ہر خریدی ہوئی چیز اور ہر مالِ غنیمت کو "مِلکِ یمین" کہتے۔

کہا جاتا ہے کہ ہم جس طرح اونٹ، گھوڑے اور دوسرے سامان حرب وغیرہ کو مالِ غنیمت میں حاصل کرتے ہیں، اسی طرح لونڈی غلام بھی غنیمت میں لاتے ہیں اور حاصل کرتے ہیں۔ اس لیے یہ لونڈی غلام ہماری "مِلک" ہیں۔ حالانکہ یہ بالکل غلط اور اوّل درجہ کا جھوٹ ہے۔ کیوں کہ گھوڑے اور اونٹ وغیرہ جنگ کے قیدی نہیں ہیں اور نہ یہ قیدی پہلے سے کسی کی مِلک تھے۔ گھوڑے اور اونٹ وغیرہ تو مال غنیمت میں ہاتھ آنے سے پہلے ان محارب کفار کی مِلک تھے۔ اب وہ مجاہدین کی مِلک ہیں۔ بخلاف ان قیدیوں کے یہ ہرگز پہلے سے لونڈی غلام نہ تھے بلکہ آزاد تھے۔ اس کے علاوہ ان قیدیوں کے لیے مسلمانوں کو فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً کا حکم ہے۔ گھوڑے اور اونٹ کے لیے یہ حکم نہیں ہے۔ اگر یہ لونڈی غلام اپنا زرِ فدیہ تقسیم سے پہلے امیر جماعت مسلمین کے پاس ادا کر دیتے، تو امیر پر فرض تھا کہ وہ فدیہ لے کر ان کو آزاد کر دے۔ نہ احساناً آزاد کرے نہ فدیہ قبول کرے اور لونڈی غلام ہی بنائے رکھے، یہ حق ہرگز امیر المسلمین کو از روئے قرآن حاصل نہیں ہے۔ اس لیے ان انسانوں کو جو ہمیں جیسے

انسان ہیں اور قید ہونے سے پہلے ہمیں جیسے آزاد تھے۔ خود قرآن نے بھی بعضکم من بعض[1] فرما کر بتا دیا کہ یہ تمہیں انسانوں میں سے ہیں۔ ان کو حیوانوں کی طرح مال غنیمت سمجھنا دراصل انسانیت پر ظلم کرنا ہے اور اسلام کے پاک و صاف دامن کو خونِ انسانیت سے آلودہ کرنا ہے۔ اگرچہ اس کا دامن کبھی آلودہ نہیں ہو سکتا۔

مَا مَلَکْتُمْ مَّفَاتِحَهٗ درحقیقت "مِلک یمین" یا "ما ملکت ایمانکم" کے معنی ہیں مَا مَلَکْتُمْ مَّفَاتِحَهٗ۔ جس کو خود قرآن مجید ہی نے بتا دیا ہے۔ جیسا کہ سورہ نور آیت ۶۱ میں ارشاد ہے: وَلَا عَلٰٓی اَنْفُسِکُمْ اَنْ تَاْکُلُوْا مِنْۢ بُیُوْتِکُمْ اَوْ بُیُوْتِ اٰبَآئِکُمْ اَوْ بُیُوْتِ اُمَّهٰتِکُمْ اَوْ بُیُوْتِ اِخْوَانِکُمْ اَوْ بُیُوْتِ اَخَوٰتِکُمْ اَوْ بُیُوْتِ اَعْمَامِکُمْ اَوْ بُیُوْتِ عَمّٰتِکُمْ اَوْ بُیُوْتِ اَخْوَالِکُمْ اَوْ بُیُوْتِ خٰلٰتِکُمْ اَوْ مَا مَلَکْتُمْ مَّفَاتِحَهٗٓ اَوْ صَدِیْقِکُمْ ؕ یعنی، اس میں تمہارے لیے کوئی حرج نہیں ہے، یہ کہ تم خاص اپنے یا اپنے باپ دادا کے گھر کھاؤ، یا اپنی ماؤں کے گھر یا اپنے بھائیوں یا بہنوں یا چچاؤں یا پھوپھیوں یا ماموؤں یا خالاؤں کے گھر کھاؤ یا اُس کے گھر کھاؤ جس کے مفاتح کے تم مالک ہو گئے ہو، یا اپنے سچے دوست کے گھر کھاؤ۔

اس آیت میں ازواج کا ذکر نہیں ہے، جس کے یہ معنی نہیں کہ کوئی شخص اپنی بیوی یا سسر یا ساس یا سالے یا سالی کے گھروں میں کھا نہیں سکتا۔ بیوی کا گھر اس کا خاص گھر ہے، اس لیے بیوتکم میں آ گیا۔ اور آباء و اُمہات میں ساس، سسر اور اخوان و اخوات میں سالے سالیاں داخل ہیں۔ باعتبار عموم مجاز کے ورنہ کیا یہ لوگ عام صدیقکم سے بھی بالکل گئے گزرے ہیں؟ بعض بزرگوں نے جو اپنے ترجمۂ قرآن کے حاشیہ پر لکھ دیا ہے کہ "مگر عورت کا۔" اگر اس کا خاوند ہو تو اس کی مرضی چاہیے۔ یعنی مذکورہ مردوں کے ہاں تو بے پوچھے بھی کھا لے سکتے ہو، مگر عورتوں کے گھر جاؤ تو جب تک اُن کے شوہر کی مرضی معلوم نہ ہو، اُس وقت تک تم اُن کے ہاں نہیں کھا سکتے۔ یہ محض احتیاط اور تقویٰ کے خیال سے لکھا ہے[2]۔ اور خود اپنی بیوی کا گھر تو اپنے گھر میں داخل ہے، اس لیے الگ سے "او بیوت ازواجکم" نہیں فرمایا گیا۔ ورنہ اپنے گھر میں کھانے کے لیے یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی کہ "تم اپنے گھر اگر کھاؤ تو کوئی حرج تمہارے لیے نہیں ہے"؟ خود اپنے گھر کھانے میں کس کو حرج محسوس ہو سکتا ہے؟ درحقیقت یہاں بیوتکم سے بیوت ازواجکم ہی مراد ہے۔ اسی طرح رشتے کے لوگوں کے بعد دو جماعتیں اور ملتی ہیں۔ ایک تو ما ملکتم مفاتحہ دوسرے صدیقکم۔ "صدیق" کہتے ہیں "سچے دوست" کو۔ جس کے ساتھ کسی طرح کی مغائرت اور تکلف نہیں ہے۔

باقی رہے ما ملکتم مفاتحہ۔ "مِلک" کے معنی "اختیار" اور "قابو" کے آتے ہیں۔ قرآن مجید میں ہے: یَوْمَ لَا تَمْلِکُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَیْئًا یعنی قیامت کا دن وہ دن ہے کہ کوئی نفس کسی دوسرے نفس کے لیے کوئی اختیار و کوئی قابو نہیں رکھے گا۔ جو شخص بہت روتا ہے یعنی ذرا سی بات میں رو دیتا ہے، اس کو کہتے ہیں لَا یَمْلِکُ عَیْنَیْهِ۔ یعنی، یہ اپنی آنکھوں پر قابو نہیں رکھتا۔ اس لیے یہاں بھی "اختیار" ہی کا مفہوم مراد ہے۔ مَفَاتِحُ "مَفْتَحٌ" کی جمع ہے، جو صیغۂ ظرف ہے، مگر مصدر کے معنی میں بہت مستعمل ہے۔ عام طور سے صیغۂ ظرف مصدر کے معنی

---

[1] قال اللہ تعالیٰ ومن لم یستطع منکم طولا ان ینکح المحصنٰت المؤمنٰت فمن ما ملکت ایمانکم من فتیٰتکم المؤمنٰت ط واللہ اعلم بایمانکم ط بعضکم من بعض ط فانکحوھن باذن اھلھن واٰتوھن اجورھن بالمعروف محصنٰت غیر مسٰفحٰت ولا متخذات اخدان ط (سورہ نساء، آیت ۲۵) یہاں بعضکم من بعض سے یہی مراد ہے کہ تم اُن کو ذلیل و حقیر نہ سمجھو۔ یہ تمہیں میں سے ہیں۔ "بعض تم میں کے بعض سے ہیں"۔ یعنی اگر اوپر سے رشتہ جوڑو گے تو دس بیس نہ سہی، چالیس پچاس سہی، ورنہ سو دو سو پانچ سو پشت پر ہی سہی، تم لوگ کہیں نہ کہیں ضرور مل جاؤ گے۔ آخر آدم و حوا علیہم السلام کی اولاد میں تو سب ہیں۔ اس لیے اُن کو اپنے ہی میں سے سمجھو اور مساوات کا حق دو۔ ۱۲ منہ

[2] اسی طرح عورتوں کے لیے اپنے شوہر کی دوسری بیویوں کے گھر جا کر کھا لینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، مگر جب شوہر کی اجازت ہو۔ "اجازت" کے معنی یہاں بہت عام ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس کا یقین ہو کہ جس رشتہ دار عورت کے گھر کھا رہے ہیں۔ اگر اس کے شوہر کو اس کا علم ہوگا تو اس کو ناگوار نہ ہوگا۔ اسی طرح عورت یہ سمجھ لے کہ اگر ہم اپنے شوہر کی دوسری بیوی کے گھر کھا لیں گے تو شوہر برا نہ مانے گا۔ ۱۲ منہ

میں آتا ہے، اسی لیے اس کو "مصدر میمی" کہا جاتا ہے تو اصل مصدر "الفتح" کے معنی ہیں کشادن، کشائش۔ یہاں بھی مفتح کے معنی کشائش ہی کے ہیں یعنی وہ شخص جس کی کشائش کا اختیار تم کو حاصل ہے۔ اب سوال یہ ہوتا ہے کہ کس چیز کی کشائش؟ تو یہ معلوم ہے کہ جب آپ نے فدیہ ادا نہ کرسکنے کی وجہ سے شد والوثاق کے حکم کے مطابق ان قیدیوں کو باندھ رکھا ہے اور گرو کی رسی میں آپ ان کو مضبوط باندھے ہوئے ہیں اور یہ غلامی کی پھانسی ان کی گردن میں آپ نے ڈال دی ہے، تو پھر یہ کیا پوچھتے ہیں کہ کس چیز کی کشائش؟ اسی "وثاق" کی کشائش جس کا "شد" آپ کیے ہوئے ہیں، جس کے لیے آپ کو بار بار فَکِّ رقبہ کی ترغیب مع الترہیب دی گئی ہے۔ غرض آپ کو اگرچہ شدالوثاق کا حکم بھی دیا گیا تھا، مگر احساناً اُس وثاق کے کھول دینے کا اختیار بھی دیا گیا تھا۔ اگر وہ فدیہ ادا کر کے خود سے اپنا وثاق کھلوا لیتے، جب تو آپ مجبور تھے، اُن کا وثاق کھول ہی دیتے۔ مگر جب یہ اپنا فدیہ ادا نہیں کر سکے اور اب تک اسی شدالوثاق کی پھانس میں جکڑے ہوئے ہیں، تو اب تو آپ ہی کے اختیار میں ہے کہ آپ فَاِمَّا مَنًّۢا (بطور احسان)، کے مطابق اُن کا وثاق کھول دیجیے۔ مگر یہ آپ کے اختیار کی بات ہے۔ ان قیدیوں کا کوئی دباؤ اُس کے لیے نہیں ہے۔ نہ اللہ تعالیٰ اپنی طرف سے کوئی دباؤ دے رہا ہے۔ بجز اس کے کہ ان کی گردن کی اس پھانس کو کھولنے کی چند تدبیریں بتا دی ہیں، کفارات کے موقع پر اور پھر ترغیبیں بھی دی ہیں، کبھی ترغیب میں بھی ترہیب کا پہلو رکھا ہے، مگر اس کو فرض نہیں کر دیا اور اس پر مجبور نہیں کیا یہاں بھی ما ملکتم مفاتحہ کہا، یعنی وہ غریب جماعت جس کے وثاق کو شد کے بعد کھول دینے کا اختیار تمہیں کو حاصل ہے، تم اُن کے گھروں میں جا کر کھا سکتے ہو، یعنی، یہاں بھی ایک پہلو فک رقبہ کی ترغیب کا نمایاں رکھا۔ سبحان اللہ! کیا بلیغ طرز بیان ہے۔

مگر خدا بُرا کرے "مال العبد مال المولیٰ" والے جاہلیت کے ظالمانہ اصول کا جس کو ہمارے علماء نے نصّ قرآنی سے زیادہ ترقطعی اور واجب الایمان والعمل تسلیم کر لیا ہے کہ یہاں ما ملکتم مفاتحہ کے معنی ہی بدل دیے، اس لیے کہ غلام کا اپنا تو کوئی گھر ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ تو اگر کوئی گھر بنائے بھی تو وہ ملک اس کے آقا ہی کی ہو جائے گا۔ اس لیے غلام کے گھر جا کر کھانے کی اجازت کی کیا ضرورت ہو سکتی ہے؟ یقیناً ما ملکتم مفاتحہ سے کوئی دوسری ہی جماعت مراد ہوگی، مگر ان بزرگوں کو اس کا خیال نہ ہوا کہ جب من بیوتکم خود اپنے گھروں تک کا ذکر یہاں موجود ہے تو پھر غلام کے گھر کا ذکر کیوں نہیں ہو سکتا؟ اور یہ مال العبد مال المولیٰ تو آپ کا خود ساختہ اصول ہے۔ بلکہ یہ زمانۂ جاہلیت کی ایک مردہ رسم کی لاش ہے۔ آپ نے دوبارہ اس میں رُوح پھونک کر زندہ کر لیا ہے۔ اس کو آپ کیوں قرآنی آیات کی غلط تاویل کے لیے آلۂ کار بنائے ہوئے ہیں؟

بعضوں نے مفاتح کو مفتاح کی جمع بتایا۔ حالانکہ مفتاح کی جمع مفاتیح آتی ہے۔ اسی طرح مِفتح بکسر میم کی جمع بھی مفاتیح ہی آتی ہے۔ مَفاتح کبھی مفتاح یا مِفتح بکسر میم کی جمع نہیں ہو سکتی کہ اس کے معنی کُنجی کے ہوں۔ مگر عربیت سے نابلد بعض عجمیوں نے ایک روایت یہ گھڑ لی کہ بعض صحابہ جب سفر میں جاتے تھے تو بعض اعزہ یا پڑوس کے لوگوں کو اپنے اپنے گھروں کی کنجیاں دے جاتے تھے اور اس کی اجازت دے دیتے تھے کہ اگر ضرورت ہو تو میرے گھر سے تم کچھ کھا پی سکتے ہو۔ مگر وہ لوگ اس امانت کے خلاف سمجھ کر اس سے احتیاط کرتے تھے، اس لیے یہ کہا گیا، تم اُن کے گھروں سے بھی کھا سکتے ہو، جن کی کنجیوں کے تم مالک ہو، مگر دوسرے اُن لوگوں نے جو عربیت سے باخبر تھے، وہ اس کی رکاکت کو سمجھے کہ "مفاتح"[1] تو کنجیوں کے معنی میں آ ہی نہیں سکتا۔ اس لیے دیکھا کہ مَفتح بالفتح خزانے کے معنی میں مجازاً آتا ہے، جیسے قارون کے خزانوں کے ذکر میں قرآن ہی میں مذکور ہے کہ مَاۤ اِنَّ مَفَاتِحَهٗ لَتَنُوْٓاُ بِالْعُصْبَةِ یعنی قارون کے خزانے ایک جماعت سے بھی بدشواری اُٹھ سکتے تھے۔ اس لیے کنجیاں نہیں بلکہ وہ

---

[1] عام لغوی اور مفسر مِفتح بالکسر اور بالفتح دونوں کی جمع مفاتح کہتے ہیں۔ چنانچہ حدیث مشہور کے متعلق لکھتے ہیں: اوتیت مفاتیح الکلم وردی مفاتح هما جمعا مفتاح ومفتح واصلهما ما یتوسل به الی استخراج المغلقات التی یتعذر الوصول الیها ...... مستعار من جمع مفتح بالکسر وهو المفتاح۔ (مجمع بحار الانوار، کذا فی الراغب وغیرہ) مدیر

لوگ سفر کے وقت اپنے خزانے جن لوگوں کے پاس امانت رکھ دیتے تھے، اُن لوگوں کو کہا گیا کہ تم جن کے خزانوں کے مالک ہو، اُن کے گھروں سے کھا سکتے ہو۔

مگر ہر صاحب عقل سلیم ادنیٰ تامل سے اس روایت کی بھی لغویت کو سمجھ سکتا ہے۔ جس شخص کے گھر میں خود کچھ لوگ ہوں گے، وہ پڑوس کو یا کسی گھر سے باہر والے کو اپنے گھر کی کنجی یا خزانہ کیوں رکھنے کے لیے دینے لگا؟ کیا اُس کے گھر کے لوگ اُس کے نزدیک باہر والوں کے برابر بھی قابل اعتماد نہیں ہیں؟ اور اگر خالی گھر بند کرکے سفر میں گئے تو پھر اُن کے گھر جاکر کھانے کے کیا معنی؟ ہاں ہوسکتا ہے کہ اُن خالی گھروں سے کوئی چیز غلہ یا آٹا وغیرہ نکال کرلے آئیں تو یہ اُن کے گھر کھانا نہیں کہا جائے گا، بلکہ اُن کی چیزوں کو اپنے مصرف میں لانا کہا جائے گا۔ پھر لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَهْلِهَا، یعنی تم اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں داخل نہ ہوا کرو جب تک موانست نہ پالو اور گھر والوں پر سلام نہ کرو۔ یہاں تو گھر والے ہی نہیں۔ کس سے موانست حاصل کی جائے گی اور کس کو سلام کیا جائے گا۔ یہ بیوت غیر مسکونہ ہیں۔ یہیں پر اُن کے لیے بھی حکم ہے کہ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ مَسْكُوْنَةٍ فِيْهَا مَتَاعٌ لَّكُمْ۔ یعنی ایسے گھروں میں جو غیر آباد ہیں۔ اگر اُن میں تمہاری کوئی پونجی ہے تو جانے میں کوئی گناہ نہیں ہے، مگر ایسے گھر کو جس کا رہنے والا کہیں گیا ہو، کبھی غیر مسکونہ نہیں کہا جاسکتا اور نہ اُن گھروں میں اُن کی پونجی رکھی ہوئی ہے۔ اس لیے کہ اگر گھر کے مالکوں نے ان کو گھر میں سے کچھ کھانے کی چیز نکال کر استعمال کرنے کی اجازت دے دی ہے تو وہ چیز اُن کی اپنی پونجی نہیں ہو جائے گی، اس لیے کہ صرف کھانے ہی بھر یہ لے جاسکتے ہیں۔ کسی دوسرے مصرف میں نہیں لاسکتے، نہ اُس کو بیچ سکتے ہیں، نہ کسی کو دے سکتے ہیں، اس لیے اُن کی پونجی وہ کبھی نہیں ہوسکتی۔ پھر اجازت کے بعد تو ایک اجنبی کے گھر سے بھی آدمی، جس چیز کی اجازت ہو، لے آسکتا ہے۔ یہاں حکم بے اجازت محض استحقاق قرابت وخلوص ومحبت کی بنا پر بے تکلفانہ کن کن گھروں سے ایک مسلمان کھا سکتا ہے، اس کا بیان ہے، اگر مالک مکان کے اجازت دینے پر موقوف ہوتا تو پھر اُن چند ہی گھروں کا ذکر نہ کیا جاتا۔ صرف اتنا کہہ دیا جاتا کہ جو لوگ تمہیں اپنے گھروں میں کھانے کی اجازت دیں، تم اُن کے گھروں سے کھا سکتے ہو۔

پھر اگر کوئی شخص کسی کو اپنی کنجی یا خزانہ امانت رکھنے کے لیے دے تو کیا وہ امین اس کنجی یا خزانے کا مالک ہو جائے گا؟ ہرگز نہیں۔ اس لیے کبھی خزانے کے امینوں کو مَا مَلَكْتُمْ مَّفَاتِحَهٗ نہیں کہا جاتا، اس لیے یہ ساری روایتیں محض من گھڑت اور بالکل بے جوڑ ہیں کسی طرح بھی ان روایات موضوعہ کے مطابق مَا مَلَكْتُمْ مَّفَاتِحَهٗ کے معنی نہیں بن سکتے۔

ایک اور باریک نکتہ زمانۂ جاہلیت میں چوں کہ اہل عرب لونڈی غلام کو درحقیقت جانوروں ہی کی طرح اپنی ملک اور انسانیت سے بالکل خارج سمجھتے تھے، اس لیے اُن کو غیر ذوی العقول ہی قرار دیتے تھے۔ قرآن مجید چوں کہ عرب کی اُس وقت کی مروجہ ہی زبان میں آترا، اس لیے عرب کے مروجہ محاورات میں قرآن نے مطلق تبدیل وتغیر نہیں کی تاکہ مخاطب قوم کی صحیح وفصیح زبان میں ہی مخاطبت ہو، اسی لیے ان غلاموں کو مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ کہا گیا۔ انسان ہونے کی وجہ سے من ملکت ایمانکم نہیں کہا گیا۔ یہاں بھی چوں کہ یہی جماعت مراد تھی، اس لیے مَا مَلَكْتُمْ مَّفَاتِحَهٗ فرمایا گیا۔ اگر غلاموں کے سوا دوسرے آزاد لوگ مراد ہوتے تو "ما"[٥] ہرگز استعمال نہ کیا جاتا بلکہ مَنْ مَلَكْتُمْ مَّفَاتِحَهٗ فرمایا جاتا جو شخص عربی سے کچھ بھی واقف ہے، وہ اس نکتہ کو سمجھ سکتا ہے۔

اتنی تشریح کے بعد بھی اگر مَالُ الْعَبْدِ مَالُ الْمَوْلٰى کو نص قرآنی سمجھنے والے نہ مانیں اور ما ملکتم مفاتحہ سے غلاموں کے سوا

---

٥ "ما" کے استعمال سے متعلق "راغب" میں ہے: وقد یعبر بہ عن الاشخاص الناطقین۔ یعنی ناطق پر بھی بولا جاتا ہے اور "من" ناطق کے لیے خاص ہے۔ مگر جب ناطق وغیر ناطق جمع ہوں۔ لقولہ تعالیٰ: منھم من یمشی علی بطنہ الخ چلنے والے جو پیٹ کے بل چلتے اور جو دو پاؤں پر اور جو چار پاؤں پر چلتے ہیں۔ (مدیر)

کوئی اور نئی جماعت خلاف منشائے الٰہی محض تعصب کی بنا پر یا ان موضوع اور خلافِ عقل و خلافِ سیاق و خلاف عبارۃ النص روایتوں کا سہارا پا پا کر ٹھہراتے ہی رہیں، تو پھر وہ جانیں اور اللہ تعالیٰ جانے۔

مختصر یہ ہے کہ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ سے مَا مَلَكْتُم مَّفَاتِحَهٗ ہی مراد ہے اور ہرگز یہ مقصد نہیں کہ جس کی جان مال سب کے تم مالک ہو۔ جب یہ بات ثابت ہو چکی کہ مَا مَلَكْتُم مَّفَاتِحَهٗ سے مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُم ہی مراد ہیں اور دوسری کوئی جماعت کسی طرح بھی مراد نہیں ہو سکتی۔ تو پھر یہ بھی اس آیت سے صاف نکل گیا کہ اپنے آقاؤں سے الگ اُن کا بھی خاص گھر ہو سکتا ہے، جن گھروں کے یہ خود مالک ہوں گے، نہ کہ اُن کے آقا۔ البتہ اُن کے آقاؤں کو یہ اجازت ہے کہ جس طرح وہ اپنے قریبی رشتہ داروں کے گھروں سے کھا سکتے ہیں، بالکل اسی طرح اپنے ملک یمین کے گھروں سے بھی بے تکلفانہ طور سے کھا سکتے ہیں۔ غرض ملک یمین بھی بطور خود گھر والے اور مال والے بخوبی ہو سکتے ہیں، صرف قید اور زرِ فدیہ میں گرو ہونے کی وجہ سے ان کے تمام انسانی حقوق اور معاشرتی و اقتصادی مواقع کو نیست و نابود نہیں کر دیا جا سکتا اور اس کے لیے قرآن اور اُسوۂ صحیحہ نبویہ سے ہرگز ہرگز کوئی سند نہیں پیش کی جا سکتی کہ یہ بے چارے تمام معاشی و اقتصادی حقوق سے محروم کر دیے گئے ہیں۔

علمائے کرام فرماتے ہیں کہ اسلام سے بغاوت اور مسلمانوں کے ساتھ قتال کرنے کے جرم میں ان قیدیوں کو انسانیت سے خارج جانوروں کی طرح مال غنیمت شمار کیا گیا اور یہ لونڈی غلام بنا لیے گئے۔ میں پوچھتا ہوں کہ آپ کو اپنی طرف سے سزا مقرر کرنے کا کہاں سے حق...... پیدا ہو گیا؟ اللہ تعالیٰ نے اسی جرم کی سزا میں شُدُّوا الْوَثَاقَ کا حکم دیا، مگر اس کے بعد آپ کی عالمانہ بولی میں اگر کہا جائے تو مانعۃ الخلو کی صورت میں فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً کا حکم آپ کو اُن کے متعلق دیا۔ اگر احساناً چھوڑ دینے کی توفیق آپ کو نہیں ہوتی، تو آپ اُن سے فدیہ کا مطالبہ کر سکتے ہیں۔ اگر وہ فدیہ نہ دیں، تو آپ زرِ فدیہ میں اُن کو اپنے ہاں گرو رکھ سکتے ہیں۔ مگر اُسی وقت تک جب تک کہ یہ زرِ فدیہ ادا نہ کر سکیں۔ جب تک یہ تقسیم نہیں ہوتے ہیں، اُس وقت تک اُن سے زرِ فدیہ وصول کرنے کا حق امیر المسلمین کو تھا اور تقسیم کے بعد اُس مجاہد کو فدیہ وصول کرنے کا حق ہے جس کے حصے میں یہ قیدی آیا ہے، کیوں کہ یہ قیدی تو حصہ میں ملا نہیں ہے، بلکہ اس کا زرِ فدیہ ملا ہے۔ اگر اُس مجاہد نے اُس کو کسی دوسرے کے ہاتھ بیچ دیا، تو اُسی قیمت پر بیچنا چاہیے جو اُس کا زرِ فدیہ ہونا چاہیے، کیوں کہ اس بیع کے یہ معنی ہیں کہ اُس مجاہد نے اُس معاملۂ گرو کو بیع کیا اور اس قیدی کے عوض اُس خریدار سے زرِ فدیہ وصول کر لیا اور اب یہ قیدی اُس خریدار کے ہاتھ گرو ہے۔ یہ اب اگر زرِ فدیہ ادا کرے گا تو اس خریدار کو، اور اس کو بخوبی یہ حق حاصل ہے کہ اپنے آقا کی خدمت سے وقت نکال کر اگر چاہے تو کما کر کچھ رقم برابر جمع کرتا جائے اور جب زرِ فدیہ کی مقدار مکمل ہو جائے، تو اپنے آقا کو ادا کر کے آزادی حاصل کر لے۔ اس کی کوئی وجہ نہیں کہ جو کچھ بھی کمائے، سب آقا کی ملک ہو جائے۔ بے شک اگر آقا اس سے اپنی ذاتی خدمت کچھ نہیں لیتا اور اس نے اس کو کمانے کا موقع دیا ہے تو اس کی کمائی میں سے بقدرِ ضرورت کچھ لے سکتا ہے، مگر ساری مزدوری خود لے لیا کرے اور اس کو کچھ نہ دے اور سمجھے کہ یہ جو کچھ بھی حاصل کرے، سب میری ملک ہے، صریح ظلم اور کھلی ہوئی ڈکیتی ہے۔ قرآن نے، رسول صلعم نے کبھی اس کی اجازت نہیں دی۔

ایک اور دلیل علماء کا یہ متفقہ فتویٰ ہے کہ اگر وہ غلام تقسیم کے وقت کسی اپنے عزیز محرم کے حصے میں آئے، تو وہ آزاد ہو جائے گا اور اپنے اور اپنے محرم رشتہ مند کا غلام نہیں قرار دیا جائے گا۔ محدثین اور فقہاء سب اسی پر متفق ہیں، مگر اس کی صحیح وجہ کوئی بھی نہیں بتاتا، حالانکہ صحیح وجہ

---

۵ یہاں آپ ان کو گھر والے اور مال والے تسلیم کرتے ہوئے ان کی غلامی کو بھی ساتھ ہی ساتھ قائم رکھتے ہیں۔ آگے چل کر ان کو نکاح کے لیے ان کا آزاد ہونا شرط قرار دیتے ہیں۔ شاید آپ کی مراد بیوی کے بغیر "گھر والے اور مال والے" ہے۔ تعجب ہے کہ وہ اتنی استطاعت رکھتے ہوئے زرِ فدیہ ادا کر کے آزادی حاصل نہ کر سکیں۔ (مدیر)

کھلی ہوئی ہے، اس لیے کہ اُن غلاموں کے لیے قرآن مجید نے دو ہی حکم تو دیے ہیں: احساناً چھوڑ دو، یا فدیہ وصول کرو۔ جب فدیہ وصول ہو جائے، تو آزاد کردو۔ ایک مسلمان اپنے محرم پر بھی احسان نہ کرے، تو پھر وہ غیروں پر کیا احسان کرے گا؟ اس لیے اول تو احساناً چھوڑ دینا اس کو لازم ہے۔ اگر ایسا ہی بے مروّت ہے، تو جب یہ قیدی اپنی ناداری کی وجہ سے اپنا زرِ فدیہ نہیں ادا کر سکتا ہے، تو پھر اُس کی طرف سے زرِ فدیہ تو اُسی محرم رشتہ مند ہی کو ادا کرنا چاہیے۔ اس لیے وہ زرِ فدیہ جو اُس کے حصّہ میں پڑا ہے وہ خود اُسی کے ذمے واجب الادا ہے، تو یہ خود ہی داین ہے اور خود ہی مدیون۔ تو بس وہ غلام بالکل آزاد ہے اور ہرگز قیدی یا غلام نہیں۔

اس متفقہ فتویٰ سے بھی ظاہر ہے کہ وہ قیدی صرف زرِ فدیہ میں گرو ہے، نہ کہ اس کی جان مال سب مالِ غنیمت ہے اور اس کا شمار انسانوں میں نہیں، بلکہ جانوروں میں ہے۔ جب انسانوں میں نہیں، تو پھر رشتہ داروں میں کیوں کر ہو سکتا ہے؟ درحقیقت راویان روایات موضوعہ نے اور ان روایات پر اعتماد کرکے فقہا نے بالکل قرآن کے خلاف ملک یمین کے متعلق سارے مسائل ہی کو ایسے عہد جاہلیت والے ظالمانہ سانچے میں ڈھالا ہے کہ ہر مدبر فی القرآن کو سخت حیرت ہوتی ہے کہ یا اللہ یہ مسائل اور یہ روایتیں واقعی دین اسلام ہی کی ہیں یا کسی اور مذہب کی؟

اسلام سے قبل جو ملک یمین چلے آرہے تھے

اسلام سے پہلے یعنی زمانۂ جاہلیت سے جو ملک یمین چلے آرہے تھے، ان کے متعلق بھی یہی حکم ہوگا، اس لیے کہ وہ بھی کسی نہ کسی جنگِ زمانۂ جاہلیت کے قیدی ہی تھے۔ مَنّاً اور فِدَآءً کا دستور زمانۂ جاہلیت میں بھی تھا۔ اگرچہ قیدیوں کو احساناً تو وہ اپنی جاہلانہ فطرت کی وجہ سے کم چھوڑتے تھے، مگر فدیہ لے کر برابر چھوڑ دیا کرتے تھے۔ جیسا کہ خود قرآن میں ہے: وَاِنْ یَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ یعنی جب وہ تمہارے پاس قیدی ہوکر آتے ہیں تو تم اُن کا فدیہ ادا کرتے ہو۔ غرض بنی اسرائیل وغیرہم سب قبائل میں یہ بین الاقوامی دستور تھا کہ جب دو قبیلوں میں یا دو ملکوں میں جنگ ہوتی تھی تو جس کی فتح ہوئی وہ شکست خوردہ جماعت کے بقیۃ السیف لوگوں کو قید کر لیتے اور اگر جی چاہا تو کبھی احساناً چھوڑ دیا، ورنہ زرِ فدیہ لے کر چھوڑ دیتے۔ البتہ فدیہ وہ اس قدر طلب کرتے کہ بسا اوقات قیدی یا اُن کے اعزہ ادا کرنے سے معذور رہ جاتے اور پھر یہ قیدی غلام بنا لیے جاتے تھے۔

اسلام کی تعلیم اور رسم جاہلیّت کا فرق

رسم جاہلیت کے وقت تو وہ یہی چاہتے تھے کہ کسی طرح یہ قیدی غلام ہی رہیں، اس لیے زرِ فدیہ زیادہ سے زیادہ طلب کرتے تھے کہ ادا نہ کر سکیں اور جب زرِ فدیہ ادا نہ ہوا تو پھر یہ قیدی بالکل جانوروں کی طرح ان کے ملک بن گئے۔ ان سے سخت سے سخت محنتیں اور مزدوریاں کرائی جاتی تھیں اور ان کے ذریعہ کمایا جاتا تھا جس طرح گھوڑے اور اونٹ سے کمایا جاتا ہے۔ ان کا سارا مال یعنی آقا کا مال ہوتا۔ اُن کو ذلیل سے ذلیل طریقے سے رکھا جاتا اور معمولی سے معمولی کھانا دیا جاتا۔ —————— اسلام نے ان کے متعلق پہلا حکم احساناً چھوڑ دینے کا دیا۔ اس کے بعد اگر احساناً چھوڑ دینا مناسب نہ ہو تو فدیہ لے کر چھوڑنے کا حکم دیا۔ لونڈی غلام بنانے کا ذکر تک نہ کیا، تاکہ مسلمانوں کے ذہن میں ان کے چھوڑنے ہی کا خیال رہے اور سب سے پہلے احساناً چھوڑ دینے کا حکم سن کر "احسان" کا خیال فدیہ طلب کرنے کی حالت میں بھی رہے۔ اس لیے جس کو محض احساناً بغیر کچھ لیے ہوئے چھوڑ دینے کا حکم پہلے مل چکا ہے، وہ اگر فدیہ کی اجازت سے فائدہ اُٹھا کر فدیہ بھی طلب کرے گا تو کم سے کم ہی فدیہ طلب کرے گا، "تاکہ احسان" کا پہلو باقی ہے۔ اسی لیے اصطلاح علما میں فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً میں "مانعۃ الخلو" ہے۔ "مانعۃ الجمع" نہیں، یعنی یہ جائز نہیں کہ نہ احساناً ہی چھوڑا جائے، نہ فدیہ ہی کا مطالبہ کیا جائے، بلکہ کوئی تیسری شکل اختیار کی جائے۔ ان دو صورتوں سے خالی ہونا ممنوع۔ اسی لیے "مانعۃ الخلو" کہا جاتا ہے اور "مانعۃ الجمع" نہیں ہے، یعنی، احسان بھی ہو اور فدیہ بھی ہو، یہ ممنوع نہیں ہے۔ دونوں کا اجتماع اس طرح جائز ہے کہ فدیہ کوئی معمولی اور آسان چیز قرار دی جائے، جس کو وہ قیدی بآسانی ادا کر سکیں، جیسا کہ جنگ بدر کے بعض

---

۵ یعنی مَن (احسان) یا فدیہ دونوں میں سے ایک پر عمل کرنا ہی پڑے گا۔ دونوں کو عمل سے خالی چھوڑ دینے کو یہ آیت منع کرتی ہے۔ (مدیر)

قیدیوں کے ساتھ کیا گیا کہ انصار کے کچھ لڑکوں کو کتابت کی تعلیم ہی ان کا فدیہ قرار دیا گیا۔ یہ احسان و فدیہ دونوں کا اجتماع ہوا، غرض اسلام نے قیدیوں کے متعلق جو پہلا حکم دیا ہے اور پہلا حکم احسان ہی کا ہے۔ پھر زر فدیہ میں گرو رکھنا جو شُدُّوا الْوَثَاقَ اور وَإِمَّا فِدَاءً دونوں کو ملا کر با قتضاء النص اسی وَإِمَّا فِدَاءً ہی کے تحت میں نکلا، اس میں احسان کا پہلو برابر ملحوظ رہے گا۔ اسی لیے پوری مساوات کے ساتھ "جو خود کھاؤ وہ اُن کو کھلاؤ، جو پہنو وہ اُن کو پہناؤ، جس طرح خود رہو اُن کو بھی رکھو" کا حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وصحبہ وسلم نے دیا۔ تاکہ اس حالت میں بھی احسان کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے اور قیدیوں کو اپنی اسیری، غلامی محسوس نہ ہو۔ ان کے علاوہ شادی بیاہ اور ان کی اولاد کے متعلق اسلام نے نہایت روادارانہ اور مساویانہ اصول قائم کیا جن کی تصریح آگے آتی ہے۔ خلط مبحث کے ڈر سے یہاں ان کی تفصیل مناسب نہیں۔

لونڈی غلام اپنے مال کے خود مالک ہیں اس موضوع اور اس دعوے کی بہت کافی دلیلیں مال العبد مال المولیٰ کی تغلیط کے سلسلے میں بیان ہو چکی ہیں۔ مگر یہ موضوع بہت زیادہ اہم ہے، اس لیے اس پر ضمناً بحث مناسب نہیں اور ضرورت محسوس ہوئی کہ اس دعوے پر مزید قرآنی دلیلیں پیش کر کے مال العبد مال المولیٰ کی مکمل تغلیط کر دی جائے اور اس موضوع کو زیادہ مدلل کر دیا جائے تاکہ مدتوں سے جو دلوں میں جمی ہوئی باتیں ہیں، ان کے نکلنے میں سہولت ہو اور نفس کے لیے دھوکے کا کوئی موقع باقی نہ رہے۔

مکاتبت کا ذکر اس سے پہلے آچکا ہے اور یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ ادائے زر فدیہ کا اختیار اس قیدی کو غلامی کے پورے دور میں ہر وقت حاصل ہے۔ یکمشت زر فدیہ مہیا ہو جانا اور اس کا اپنے آقا کے سامنے پیش کر دینا شرط ہے۔ اس کے بعد آقا کو فدیہ قبول نہ کرنے کا کوئی شرعی حق نہیں ہے، بجز اس کے کہ وہ اس رقم کو فدیہ کی مقدار سے کم کہے اور اس کمی کی وجہ سے واپس کرے، تو اس کا فیصلہ امیر جماعت مسلمین یا دو چار منصف اور نیک نفس مسلمان کر دیں گے اور "احسان" کے پہلو کو مدِنظر رکھتے ہوئے مناسب مقدار فدیہ کی آقا اور غلام دونوں کو بتا دیں گے۔ اگر آقا زیادہ احسان اور رعایت کرنے پر تیار نہ ہوتا ہو، تو اُس کو "احسان" کے پہلو کی طرف متوجہ کر کے جس قدر فدیہ وہ پیش کر رہا ہے، اُسی کو قبول کر لینے کا مشورہ دیں گے خصوصاً اگر وہ غلام مسلمان ہو گیا ہو کہ لَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ یعنی قرآن میں ہے: باہمی احسان و مروت کو بھول نہ جایا کرو اور اگر غلام غیر مسلم ہے، جب بھی اس کے ساتھ احسان و حسن سلوک کرنا اسلامی اخلاق کا بہتر نمونہ پیش کرنا ہے، اس لیے صرف غیر مسلم ہونے کی وجہ سے اُس کو احسان سے محروم رکھنے کی کوئی وجہ نہیں۔

مگر غلام مسلم ہو یا غیر مسلم اس کا موقع تو جب ہی اُس کو مل سکتا ہے کہ وہ خود بھی مال کا مالک ہو سکے، کچھ کما کر تھوڑا تھوڑا جمع کر سکے۔ کسی سے قرض بھی تب ہی لے سکتا ہے، جب وہ کما کر قرض ادا کر سکے اور کوئی قرض بھی اسی صورت میں دے گا کہ اُس سے وصول ہونے کی امید ہو۔ سب لوگ یہی سمجھیں گے کہ یہ تو کسی مال کا مالک ہو ہی نہیں سکتا، جو مال بھی اس کو ملے گا، وہ اُس کے مالک کا ہو جائے گا تو پھر یہ غریب یکمشت یا بدفعات کس طرح اپنا زر قرض ادا کر سکتا ہے۔ درحقیقت یہ مال العبد مال المولیٰ والی نص شیطانی اسی لیے وضع کی گئی ہے کہ لونڈیوں اور غلاموں کو

ے کیا اسیران جنگ کے ساتھ ایسا سلوک واجب، فرض یا ممکن ہے؟ ایک شخص اطلس و حریر کا لباس پہنتا ہے، ہوائی جہاز کی سواری کرتا ہے، نہایت قیمتی کھانا کھاتا ہے۔ محلات میں بود و باش رکھتا ہے۔ نہایت حسین عورت یا چند عورتوں سے شادی کرتا ہے، کیا اُس پر یہ لازم ہے کہ اگر وہ اپنی ذات پر ایک ہزار روپے ماہوار صرف کرتا ہے، تو ایک ہی ہزار اپنے عبد مملوک کو ہر مہینے ادا کرے؟ ملک یمین کا جواز تو اس لیے ہے کہ جہاں سیاسی طور پر مسلمانوں کے ہاتھ مضبوط ہوں، وہاں ان غلاموں کے ذریعے ان کی منزلی زندگی میں بھی فائدہ اُٹھایا جا سکے۔ لیکن اگر یہ لوگ یعنی اسیران جنگ اُلٹا اقتصادی اور معاشی بوجھ کا باعث ہوں تو پھر ان پر قبضے کا کیا فائدہ؟ هل لكم من ما ملكت ايمانكم من شركاء في ما رزقناكم فانتم فيه سواء تخافونهم كخيفتكم انفسكم (روم آیت ۲۸) کیا ہمارے دیے ہوئے رزق میں تمہارے لونڈی غلام تمہارے ساتھ برابر کے شریک ہو سکتے ہیں، کیا تم ان سے اسی طرح ڈرتے ہو، جس طرح اپنے لوگوں سے؟ (مدیر)

تا زندگی اپنا مملوک بنائے رکھیے اور کبھی ان کو اس کا موقع نہ دیجئے کہ کما کر زرِ فدیہ ادا کر سکیں، جو کچھ بھی کہیں سے لائیں، سب اُن سے چھین لیا کیجئے کہ یہ فقیر کے فقیر رہیں۔

مکاتبت ایک احسان ہے۔ اس اعتبار سے کہ آقا اس بات پر راضی ہو جاتا ہے کہ اس کا مِلکِ یمین توڑ توڑ کر بدفعات واقساط اپنا زرِ فدیہ ادا کرے۔ یہ صورت "احسان" اور "فدیہ" دونوں کے اجتماع کی ہے۔ اگر مِلکِ یمین غیر مسلم ہو اور وہ مکاتبت کا خواست گار ہو تو مکاتب کر دینا بہتر ہے، مستحب ہے، کارِ ثواب ہے، تاکہ اسلامی اخلاق کا ایک اچھا نمونہ ثابت ہو۔

اور اگر مِلکِ یمین مسلم ہو تو آقا پر فرض ہے کہ اُس کو مکاتب کر دے، جیسا کہ فکاتبوھم ان علمتم فیھم خیرا سے ظاہر ہے۔ اگر غلام کا ہر مال آقا کا مال ہو جاتا ہے تو پھر وہ کما کما کر ہر قسط میں ادا کیا کرے گا؟ وہ تو آقا ہی کا مال آقا کو دے رہا ہے۔ اس لیے یکمشت ادائے زرِ فدیہ کا حق اور باقساط ادا کرنے کا رعایتی حق خود اس کو ظاہر کر رہا ہے کہ غلام بھی مال کا مالک ہو سکتا ہے اور وہ اپنا مال اپنے آقا کو یکمشت یا باقساط جس طرح بھی چاہے زرِ فدیہ میں ادا کر سکتا ہے۔ اسی طرح وہ اپنے رہنے سہنے کے لیے آقا سے علیحدہ اپنا مستقل گھر بھی بنا سکتا ہے اور اپنی کمائی سے اپنے کھانے پینے کا انتظام بھی اپنی مرضی کے مطابق کر سکتا ہے، جس میں آقا بھی کبھی کبھی جا کر کھا سکتا ہے جیسا کہ اَوْ مَا مَلَکْتُمْ مَّفَاتِحَہٗٓ والی آیت سے ظاہر ہے۔

پھر حکم ہے کہ وَاَنْکِحُوا الْاَیَامٰی مِنْکُمْ وَالصّٰلِحِیْنَ مِنْ عِبَادِکُمْ وَاِمَآئِکُمْ[1] اِنْ یَّکُوْنُوْا فُقَرَآءَ یُغْنِھِمُ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ۔ یعنی اپنی بے شوہر عورتوں کا اور نیک کار غلاموں اور لونڈیوں کا نکاح کر دو، اگر وہ فقیر ہیں تو اللہ تعالیٰ اُن کو اپنے فضل سے غنی کر دے گا (سورہ نور آیت ۳۲)

اور سورہ نساء آیت ۲۳ میں ہے: حُرِّمَتْ عَلَیْکُمْ ...... اِلیٰ ..... وَاُحِلَّ لَکُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِکُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِکُمْ مُّحْصِنِیْنَ غَیْرَ مُسٰفِحِیْنَ

یعنی فلاں فلاں عورتیں تم پر حرام ہیں۔ ان کے ماوراء سب تمہارے لیے حلال ہیں، ان سے تم اپنے مال کے ذریعے یعنی اپنا مال دے کر نکاح کرو، اپنا گھر آباد کرنے کے لیے۔ صرف شہوت رانی کے لیے نہیں۔ اس لیے نکاح کے لیے "ابتغاء[2] بمالہ" ضروری ہے۔ غلام کے پاس تو مال ہو ہی نہیں سکتا (بقول ہمارے علماء کے) تو وہ آخر کس طرح ابتغاء بمالہ کر سکتا ہے۔ اگر کہا جائے کہ آقا اس کو مال دے دے گا۔ جب بھی وہ مال آقا ہی کا رہے گا۔ کیوں کہ غلام اُن کے نزدیک لَا یَقْدِرُ عَلٰی شَیْءٍ ہے جس کے معنی ان کے نزدیک لَا یَمْلِکُ شَیْئًا ہیں۔ تو جو شخص کسی مال کا مالک ہو ہی نہیں سکتا۔ جیسے اونٹ گھوڑے وغیرہ، تو پھر آقا کس کو مال دے گا؟ اس لیے ضروری ہے کہ غلاموں کے پاس بھی مال ہو کہ اگر وہ نکاح کریں تو اِبْتِغَاءٌ بِمَالِہٖ کر سکیں۔ اسی طرح اگر لونڈی ہو، تو اُس کو زرِ مہر جو ملے گا وہ اس کی مِلک ہو گا۔ نہ کہ اُس کے آقا کی، کیوں کہ اگر وہ زرِ مہر آقا کی مِلک ہو جائے گا تو اس لونڈی سے نکاح کرنے والے نے ابتغاء بمالہ نہ کیا بلکہ مال دیا آقا کو اور ابتغاء کیا لونڈی کے ساتھ۔ اس لیے اس نے لونڈی سے اُس مال کے ذریعے مِلکِ استمتاع[3] حاصل نہ کیا۔ اسی قرآن میں حکم ہے کہ لونڈیوں سے نکاح کرو تو ان کے آقاؤں کی اجازت سے،

---

[1] اگر اپنی لونڈیوں کو بلا نکاح فراش بنانے کا حق آقا کو حاصل ہوتا تو لونڈیوں کے نکاح کر دینا حکم نہ ہوتا۔ بلکہ یوں کہا جاتا کہ تم اپنی لونڈیوں کو اپنا فراش بنا لو۔ اگر نہیں بناتے تو کسی دوسرے سے ان کا نکاح کر دو۔ یہاں جس طرح غلاموں کے نکاح کے لیے حکم ہوا، بالکل اُسی طرح لونڈیوں کے نکاح کا حکم ہے یعنی جس طرح غلاموں کو بلا نکاح آقا شِ اپنا ہم بستر نہیں بنا سکتی، بالکل اسی طرح لونڈیوں کو ان کا آقا بلا نکاح ہم بستر نہیں بنا سکتا۔ اسی لیے دونوں کے لیے یکساں طور سے نکاح کر دینے کا حکم ہوا۔ چاہے وہ نکاح خود اپنے ساتھ ہو یا دوسرے کے ساتھ۔ فافہم ۱۲ منہ

[2] مال کے ذریعے نکاح چاہنا

[3] فائدہ اٹھانے کا اختیار

مگر ان کا مہر انہیں کو دو جیسا کہ فرمایا: فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَ اٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ نِحْلَةً - یہ نہیں فرمایا کہ ان کا مہر اُن کے آقاؤں کو دے دو۔ اس لیے یقیناً لونڈی غلام سب مال رکھ سکتے ہیں، مال کے مالک ہو سکتے ہیں، اپنا گھر خود بنا سکتے ہیں اور اپنے کھانے پینے کا بطور خود انتظام رکھ سکتے ہیں، تجارت اور صنعت و حرفت وغیرہ کے ذریعہ دولت جمع کر سکتے ہیں، ان کو معاشی و اقتصادی ہر طرح کی پوری آزادی حاصل ہے۔ اسلام نے اِن سے اِن کے کسی معاشی و اخلاقی حق کو نہیں چھینا، بجز اس کے کہ یہ جب تک اپنا زرِ فدیہ ادا نہ کر لیں، یا معاف نہ کرا لیں، قید میں رہیں گے اور آقا کی خدمت بھی کسی حد تک کرتے رہیں گے۔ مگر پوری مساوات کے ساتھ اپنے مال میں یہ اپنے آقا کا بھی حق کسی قدر سمجھیں گے۔ اگر آقا کچھ لے لے تو اُن کو ناگوار نہیں ہونا چاہیے۔ جس طرح باپ اگر بیٹے کے مال میں سے لے لے تو بیٹے کو ناگوار نہیں ہوتا۔

پھر جو یہ فرمایا گیا کہ اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ - اس سے صاف ظاہر ہے کہ عباد و اماء بھی غنی ہو سکتے ہیں اور ظاہر ہے کہ جب تک وہ خود مال کے مالک نہیں ہو سکتے، غنی نہیں ہو سکتے۔ غنی کے تو معنی ہی یہی ہیں کہ وہ کسی کے محتاج نہ رہیں۔ اگر اپنے آقا کے محتاج رہے تو پھر غنی کیوں کر ہوں گے؟

لونڈی غلام میں کوئی فرق نہیں ایک عجیب و غریب چیز جو ہمارے علماء نے پیدا کر رکھی ہے وہ یہ ہے کہ لونڈی کے ساتھ بغیر نکاح کے یہ مجامعت کا حق سمجھتے ہیں، مگر عورت کے اگر غلام ہو، تو عورت کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ غلام سے اس قسم کا تعلق بغیر نکاح کے پیدا کرے۔ حالانکہ لونڈی اور غلام دونوں کی بالکل ایک ہی سی حیثیت ہے۔ دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ جہاد میں لونڈیاں ہوں یا غلام دونوں یکساں قید کیے گئے اور زرِ فدیہ کا مطالبہ دونوں سے یکساں ہوا۔ اگر دونوں نے اپنا اپنا زرِ فدیہ دے دیا تو دونوں یکساں آزاد ہو جائیں گے۔ زرِ فدیہ نہ ادا کر سکے تو دونوں یکساں طور سے زرِ فدیہ میں گرو ہوں گے، معاشی و اقتصادی حقوق دونوں کے یکساں محفوظ رہیں گے۔ اگر دونوں ایمان لے آئے، تو پھر ان دونوں کے ساتھ اخوت اسلامی کا یکساں برتاؤ کیا جائے گا۔ رہنے سہنے، کھانے پینے میں مساوات دونوں سے یکساں طور سے برتی جائے گی۔ گھر کے کام کاج میں ہاتھ بٹانے کا دونوں کو یکساں موقع دیا جائے گا اور خدمت یکساں ہی دونوں سے لی جائے گی۔ غرض چوں کہ دونوں کی اسیری اور زرِ فدیہ میں گرو ہونے کی حیثیت بالکل یکساں ہے، اس لیے تمام باتوں میں یقیناً دونوں کو یکساں ہی رہنا چاہیے۔ کوئی وجہ نہیں ہے کہ لونڈی پر کوئی فاضل حق آقا کو حاصل ہو جائے، جو غلام پر نہ ہو، چاہے وہ لونڈی جہاد میں آئی ہو یا خریدی گئی ہو۔ کیوں کہ خریدنے میں بھی جس نوعیت سے غلام خریدا جاتا ہے، بالکل اسی نوعیت سے لونڈی بھی خریدی جاتی ہے۔ خود بیچنے والے کو شرعاً جس بات کا حق نہیں، وہ اس حق کو کیوں کر بیچ سکتا ہے اس لیے یقیناً لونڈی کے ساتھ بغیر نکاح کے مجامعت بِغاء یعنی زنا ہے۔

آیت اظہار زینت سے استدلال قرآن مجید میں عورتوں کو حکم ہے کہ لَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ ...... اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ یعنی مسلمان عورتیں اپنی زینت ظاہر نہ ہونے دیں مگر اپنے شوہروں کے سامنے، اور باپ دادا، بیٹے اور فلاں فلاں کے سامنے، یا اپنے غلاموں کے سامنے......" اس آیت میں دو باتیں غور طلب ہیں۔ بعولۃ تو شوہروں کو کہتے ہیں۔ مولاؤں اور آقاؤں کو بعل (خاوند) نہیں کہتے۔ اس لیے لونڈی اپنے آقا سے "ابدائے زینت" کرے گی یا نہیں؟ اگر کرے گی تو وہ اُن نامبردہ انواع میں سے کس نوع میں آقا کو داخل سمجھے گی؟ اور اگر آقا سے ابدائے زینت (اظہار) نہیں کر سکتی۔ اس لیے کہ اُس فہرست میں موالی یعنی آقا کا کوئی ذکر نہیں ہے تو جب ابدائے زینت آقا کے سامنے جائز نہیں، تو حفاظتِ فروج بھی ضرور آقا سے واجب ہوگی۔ وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ کے رو سے، اس لیے کہ جس سے حفاظت زینت فرض ہے اُس سے حفاظتِ فروج تو بدرجۂ اولیٰ فرض ہوگی۔

اگر کہا جائے کہ بعولۃ (شوہروں) میں آقا داخل سمجھا جائے گا اس لیے کہ اس لیے کہ اُس نے اِس کو اپنا فراش بنا لیا ہے اور صاحب فراش ہی کو تو بعل کہتے ہیں تو پھر مزنیہ کے لیے زانی کو بعل ہو جانا چاہیے۔ کیوں کہ اُس نے اس کو اپنا فراش بنا لیا، حالانکہ کوئی بھی زانی کو

مزنیہ[ے] کا بعل نہیں کہتا اور جب آقا بعل ہو جاتا ہے، اپنی ملک یمین کا، اُس کو فراش بنا لینے کے بعد، تو پھر وہ ملک یمین اُس کی زوجہ کیوں نہ کہی جائے گی ؟ اور کیوں نہ ہو جائے گی ؟ اس کے علاوہ جب تک کہ آقا نے اُس کو اپنا فراش نہیں بنایا ہے۔ اُس وقت تک کسی طرح بھی وہ بعولتہ (شوہروں) میں داخل نہیں ہو سکتا اور پھر اس فہرست سے بالکل خارج ہی رہے گا، اس لیے ملک یمین اپنے اُس آقا سے جس نے ابھی اُس کو جہاد میں حاصل کیا ہے یا خریدا ہے، فراش بنانے سے پہلے یا جس آقا نے فراش بنانے کا ارادہ ہی نہیں کیا ہے، اُس سے حفاظت زینت کرے گی یا نہیں ؟ نہیں کرے گی تو پھر اس فہرست مندرجۂ آیت زینت میں سے کس صنف میں وہ آقا کو سمجھے گی ؟ اور کرے گی تو پھر اپنے اس آقا سے اس کو حفاظت فرج بھی واجب ہی ہوگی۔ کیوں کہ حفاظت زینت سے حفاظت فروج زیادہ ضروری ہے۔ اور جب حفاظت فروج کرے گی تو پھر فراش بھی یہ نہیں بن سکتی۔ کیوں کہ فراش بننا ہی درحقیقت حکم حفاظت زینت کی مخالفت ہے۔

دوسری بات اس آیت منع ابدائے زینت (نمائش) میں یہ غور طلب ہے کہ جس طرح شوہر اور باپ بھائی بیٹے وغیرہ کے سامنے ابدائے زینت کی عورتوں کو اجازت ہے، اسی طرح اپنے غلاموں کے سامنے بھی ابدائے زینت کی اجازت ہے۔ تو پھر عورتوں کے لیے اُن کے غلام کس صنف میں داخل ہوں گے ؟ شوہر کے حکم میں ؟ یا باپ بھائی بیٹے کے حکم میں ؟ شوہر سے تو اس لیے ابدائے زینت کی اجازت ہے کہ اُن سے عورتوں پر حفاظت فروج واجب نہیں، تو جب ابدائے فروج کی ان کے سامنے اجازت ہے تو ابدائے زینت ان کے سامنے کیوں ممنوع ہوگا؟ اس لیے ظاہر ہے کہ عورتوں کے لیے غلام شوہر کے حکم میں نہیں ہیں، بلکہ باپ بھائی بیٹے کے حکم میں ہیں۔ اسی لیے جب تک وہ آزاد نہ ہو جائیں، اس وقت تک اُن کی آقائن کا اُن سے نکاح جائز نہیں ہے۔

تو کوئی وجہ نہیں کہ عورت کے لیے تو اس کا ملک یمین محرم ہو جائے اور جب تک آزاد نہ ہو، باہم نکاح تک حرام ہو جائے اور مرد کے لیے اس کی ملک یمین ایسی حلال ہو جائے کہ بغیر آزاد کیے ہی نہیں بلکہ بغیر نکاح کے بھی فراش بن سکے۔ آخر یہ فرق کس بنا پر ہوگا ؟

لونڈی کو بغیر نکاح فراش بنانا بغاء ہے

سورہ نور آیت ۳۳ میں ہے: وَلَا تُكْرِهُوا فَتَيَاتِكُمُ الْمُؤْمِنَاتِ عَلَى الْبِغَاءِ إِنْ أَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِتَبْتَغُوا عَرَضَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۚ وَمَنْ يُكْرِهْهُنَّ فَإِنَّ اللَّهَ مِنْ بَعْدِ إِكْرَاهِهِنَّ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝ یعنی اے مسلمانو! تم اپنی مسلمان لونڈیوں کو بغاء (زنا) پر مجبور نہ کرو (خصوصاً) جب وہ تحصّن (بیوی بن کر رہنے) کی خواہش مند ہوں اور اس بغاء سے تمہاری غرض حیات دنیاوی کا نفع ہو۔ اور اگر کسی نے اُن کو بغاء پر مجبور کر دیا (اور مجبور ہو کر یہ بغاء پر آمادہ ہو گئیں) تو (ان کے لیے) اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔

زن و مرد کے باہمی تعلق کی دو ہی صورت ہے، یا تحصّن واحصان یعنی عورت بھی بیوی بن کر گھر میں رہنا چاہے اور مرد بھی اُس کو بیوی ہی بنا کر گھر بسانا چاہے۔ یا بغاء جس کی دو صورتیں ہیں، پوشیدہ آشنائی جس کو قرآن میں اِتِّخَاذُ الْأَخْدَانِ کہا گیا ہے، یا علانیہ تعلق محض شہوت رانی کے لیے، جس کو مسافحۃ، سفاح فرمایا گیا ہے اور ناگہانی طور سے اگر کسی وقت کسی مرد و عورت میں باوجود مغایرت کے ایسا واقعہ ہو گیا تو اُس کو "زنا" کہتے ہیں۔ اگرچہ ہر بغاء زنا ہے اور ہر زنا بغاء۔ مگر محاورۃً بغاء کے تعلقات میں پائداری ہوتی ہے اور "زنا" ایک ناگہانی واقعہ ہے۔ اس آیت میں مسلمانوں کو منع کیا گیا ہے کہ تم اپنی لونڈیوں کو بغاء پر یعنی سفاح پر یا اتخاذ الاخدان پر مجبور نہ کرو۔ یعنی اُن کو محض رشوت رانی کا ذریعہ نہ بناؤ۔ جس طرح عہد جاہلیت میں دستور تھا۔ اس میں بظاہر یہ شرط لگی ہوئی ہے کہ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا اگر وہ تحصّن کی خواہش مند ہوں۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ اگر تحصّن کی خواہش مند نہ ہوں تو بغاء پر اُن کو مجبور کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ تو تحصّن کی خواہش مند ہی ہوں گی، اس لیے جب وہ تحصّن چاہ رہی ہیں تو ان کو زنا پر مجبور نہ کرو۔ یہی معنی تمام مفسرین کے نزدیک ہیں۔ مگر اس کے لیے مفسرین نے طرح طرح کی نحوی تاویلیں جو کی ہیں وہ کم علم اور ناواقفانِ ادبِ عربی کو سمجھانے کے لیے، ورنہ جو لوگ ادبِ عربی سے باخبر ہیں، اُن کو اس قسم کی نحوی تاویلوں کی

[ے] زنا والی عورت کا خاوند

مطلق ضرورت نہیں۔

مقصد یہ ہے کہ فطرۃً کوئی عورت یہ نہیں چاہتی کہ ایک یا مختلف مردوں کی محض شہوت رانی کا ذریعہ بن کر رہے ؎

کچھ شمع کا جلنا نہیں عُشّاق کا جلنا　　یہ بہر نشاطِ دگراں ہو نہیں سکتا

ہر عورت یہ ضرور چاہتی ہے کہ وہ کسی مرد کی بیوی، گھر بسی بن کر رہے، اور وہ مرد اُس کا شوہر ہو، اس لیے ہر اُس مسلم کو جس کے پاس لونڈی ہو، یہ حکم ہؤا، ایسا نہ کرو کہ ان غریبوں کو نہ اپنی مُحصَنَہ بناؤ، نہ کسی دوسرے کی مُحصَنَہ بننے دو، محض اپنے لیے یا کسی دوسرے کے لیے ایک ذریعہ شہوت رانی بننے پر مجبور کردو۔ اس لیے اس آیت میں بلا احصان صرف مسافحت یا اتخاذ الاخدان کے طور پر ان سے تعلقات فراشی قائم کرنے کی ممانعت ہے۔ جس کو جائز سمجھ لیا گیا ہے اور اُس کو جائز قرار دینے کے لیے ہی اس آیت کی شان نزول کی روایتیں گھڑی گئیں، تاکہ بعبارۃ النص جو معنی نکل رہے ہیں، اُن کے خلاف ایک معنی نکالے جائیں اور یہ کہا جائے کہ اس آیت؎ میں لونڈیوں سے پیشۂ زنا کرا کے آمدنی پیدا کرنے کی ممانعت ہے اور اس کی ممانعت ہے کہ کسی دوسرے سے زنا کرنے پر ان کو مجبور نہ کرو۔ حالانکہ یہ مفہوم کسی طرح بھی نہیں نکل سکتا۔

؎ اس آیت کی شان نزول میں مفسر کہتے ہیں کہ عبداللہ بن سلول ایک منافق تھا، اس کے پاس متعدد کنیزیں تھیں یا ایک کنیز معاذہ یا میکہ نامی تھی، یا دو ایسے شخص تھے جن میں ایک عبداللہ تھا، یہ اپنی کنیزوں کو ان کے انکار کے باوجود جلب منفعت کے لیے یا اپنے مہمانوں کو خوش کرنے کے لیے زنا پر مجبور کرتے تھے۔ یہ شکایت شدہ شدہ آں حضرت صلعم تک پہنچی۔ آپ نے اس کا سدباب فرمایا۔ اس پر عبداللہ نے شور مچایا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: لا تکرھوا فتیٰتکم علی البغاء، یعنی اپنی لونڈیوں کو زنا پر مجبور نہ کرو —— اس روایت کے راویوں کا یہ حال ہے کہ تنقید کے اماموں نے کسی کو کذاب وخبیث قرار دیا ہے، کسی کو شیعی، کسی کو زانی، بدمعاملہ، مفتری، ناقابل سند، ضعیف، کسی کو کٹر رافضی حد سے گزرا ہؤا شیعی اور کسی کو ردی المذہب وغیرہ کہا ہے۔

بس یہ تمام روایات وضعی ہیں، جن پر مفسروں نے بھروسہ کیا ہے اور اس آیہ کی تفسیر میں بطور ذیل پیش کیا ہے اور آیت کے صریح الفاظ پر توجہ نہیں کی کہ وہ کھلے طور پر مسلمانوں کو مخاطب کر رہی ہے، نہ کہ کسی منافق کو، اور بغاء زنا ہے عام اس سے کھلا ہو یا چھپ کر، یہ دونوں ہی مسلمانوں پر حرام ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے مسلمان میاں بیوی کا تعلق احصان (پاک دامنی) ہی کی صورت میں حلال فرمایا ہے اور احصان، نکاح کے بعد ہی ممکن ہو سکتا ہے۔

اور یہ جو ارشاد ہے: ان اردن تحصناً الخ اگر لونڈیاں پاک دامن منکوحہ بننا چاہیں تو ان کو بدکاری پر مجبور نہ کرو۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اگر وہ پاک دامنی کی طرف راغب نہ ہوں تو بے شک ان کو گناہ کی جہنم میں دھکیل دو۔ یہ تو ایسا ہی ہے، جیسا سیدہ مریم ؑ نے کہا: انی اعوذ بالرحمٰن منک ان کنت تقیا۔ اے شخص اگر تو نیک پرہیزگار ہے تو میں تجھ سے رحمٰن کی پناہ چاہتی ہوں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اگر تو پرہیزگار نہیں تو میں تجھ سے رحمٰن کی پناہ نہیں چاہتی۔ ایسی آیتوں میں لفظ لا سیما (خاص کر) محذوف ہوتا ہے۔ یعنی خاص کر اگر تو پرہیزگار ہے۔ خاص کر اگر لونڈیاں نیک بیوی بن کر رہنے کا ارادہ کریں۔ کلام عرب میں اس کی بہت مثالیں ہیں جب کہ جزا شرط پر مقدم ہو۔ تعجب ہے کہ یہ بات تمام مفسرین کی نگاہ سے پوشیدہ رہی۔ البتہ خطیب بغدادی نے تلخیص المفتاح اور تفتازانی نے مطول میں کہا ہے کہ ان اردن تحصناً بصورت ماضی لونڈیوں کی پاک دامنی کی طرف زیادہ رغبت کا بیان ہے (مطول ص۱۵۰) لیکن جو کچھ میں نے ذکر کیا ہے، اس کا خیال ادھر نہیں گیا اور عام مفسروں کی طرح لغو تاویلوں میں اُلجھ گیا ہے۔ جو عقل سلیم کے موافق کوئی مطلب نہیں پیدا کر سکے۔ منہ غفرلہ

(ملخصاً ترجمہ حاشیہ (ادارہ))

اس لیے کہ کسی دوسرے کی تخصیص بھی من گھڑت ہے اور پیشہ کرانے کا مفہوم بھی اپنی طرف سے ہے۔ آیت میں اُس کا یا اس کا کہیں ذکر نہیں اور اگر یہی معنی ہوتے تو المؤمنات کی قید لگائی نہ جاتی۔ کیا کافرات سے زنا کرانا جائز ہے؟ چوں کہ یہ معلوم تھا کہ ملک یمین اگر کافرہ مشرکہ ہو تو لا تمسکوا بعصم الکوافر کے حکم کے مطابق مسلمان اُن کو کبھی فراش نہ بنائیں گے۔ اس لیے فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ فرمایا گیا۔ اور اگر وہ اہل کتاب سے ہو، تو تبعاً للمؤمنات، اُسی المؤمنات ہی کے حکم میں ہوگی۔ اس لیے یہاں المؤمنات دراصل کوافر کے مقابلہ میں وارد ہے، تو چوں کہ کوافر کو تو وہ منع امساک کے حکم کے رو سے فراش بنائیں گے ہی نہیں۔ البتہ غیر کوافر کے ساتھ رسم جاہلیت کے مطابق وہ بلا نکاح فراش بنا کر بغاء کرتے تھے اس لیے یہاں المؤمنات کی قید لگا دی گئی۔

باقی رہا لتبتغوا عرض الحیوٰۃ الدنیا کا ٹکڑا، تو اس کے یہی معنی ہیں کہ تم چاہتے ہو کہ اگر اُن کو محصنات بنا لیں گے تو پھر یہ لونڈیاں نہ رہیں گی، بلکہ آزاد ہو جائیں گی اور بیویاں ہو کر تمام حقوق ازواج کی ہم سے طالب ہوں گی اور زر مہر میں ان کا زرِ فدیہ بھی ادا ہو جائے گا اور اگر اُن کو مسافحۃ یا اتخاذ الاخدان کے ذریعہ بغاء پر مجبور کریں گے تو یہ لونڈی کی لونڈی رہیں گی، زرِ فدیہ بھی اُن کے ذمہ واجب الادا ہی رہے گا، ان کو بیچ کر اُن کا زرِ فدیہ خریدار سے وصول کر سکتے ہیں۔ پھر ہمارے بعد ہمارے ورثے میں بھی یہ تقسیم ہو سکیں گی (اگر اُن سے اولاد نہ ہوئی) غرض ان دنیاوی مفاد کی خاطر تم جو اُن کو اپنی محصنات نہیں بناتے اور سفاح یا اتخاذ الاخدان کے ذریعے اُن کو بغاء پر مجبور کرتے ہو، ایسا نہ کرو خصوصاً جب یہ فطرۃً تحصن ہی کی خواہش مند ہیں۔

اس ممانعت کی وجہ بغاء یعنی زنا کا ممنوع ہونا تو مسلم ہی تھا اور ہے۔ کسی کو حرام کاری پر مجبور کرنا، ایسا بُرا اور ممنوع ہے کہ اس کے لیے کسی آیت کے نازل کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ کسی اختیاری عورت سے زنا کرانا اور اس زنا کی اُجرت خود اپنے مصرف میں لانا ایسی بے حیائی ہے کہ ہر زمانے اور ہر طبقے میں یہ معیوب ہی سمجھا جاتا ہے اور اہل مذاہب کے نزدیک تو ایسا ممنوع ہے کہ اس کے لیے کسی خاص حکم کے وارد کرنے کی کبھی ضرورت محسوس نہیں ہوئی کیوں کہ اس کا ممنوع ہونا بدیہی ہے۔ غرض لَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا ۝ بنی اسرائیل آیت ۳۲) اور اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۙ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ (سورہ نور آیت ۱۹) کے عموم بیان اور بلاغت ادا کو دیکھیے کہ اس سلسلے کے تمام جرائم پر حاوی ہے۔ بخلاف اس آیت کے کہ اگر اُس سے پیشہ کرانے کی ممانعت نکلتی ہے، تو صرف اپنی مسلمان لونڈیوں سے، اور وہ بھی جب کہ وہ تحصن کی خواہش مند ہوں۔ مسلمان لونڈیوں کے علاوہ دوسری عورتوں سے پیشہ کرانے کی ممانعت نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس آیت سے پیشہ کرانے کی وہ بھی صرف اپنی مسلمان لونڈیوں سے ممانعت نکالی جاتی ہے، تو یہ ایک تحصیل حاصل ہے، جو سورہ بنی اسرائیل اور سورہ نور کی مذکورہ آیتوں سے نکل رہی ہے۔ لا تقربوا کی بلاغت اسب پر محیط ہے پیشہ کرانا صرف مسلمان لونڈیوں ہی کے ساتھ مخصوص نہیں۔ آج صدیوں سے بیسیوں ممالک میں ایسے لوگ ہیں جو اپنی رشتہ دار عورتوں سے اور اجنبی عورتوں سے پیشہ کراتے ہیں۔ اس لیے یقیناً یہاں کوئی ایسا ہی کام ممنوع کیا جا رہا ہے جس کا تعلق لونڈیوں ہی سے ہو۔ ورنہ عام ممانعت کی ضرورت کے موقع پر خاص ممانعت بالکل مخالف بلاغتِ بیان بلکہ مخالفِ حکمت ہے۔

وہ خاص کام جو لونڈیوں ہی کے ساتھ مخصوص تھا وہ یہی تھا کہ زمانہ جاہلیت سے یہ رواج آ رہا تھا کہ لوگ لونڈیوں کو بلا نکاح کے اپنی فراش بنا لیا کرتے تھے، اور اُس سے اُن کی مراد صرف مسافحت ہوا کرتی تھی۔ اُن کو محصنہ بنا کر نہیں رکھتے تھے بلکہ اس تعلق کے بعد بھی وہ لونڈی کی لونڈی ہی رہتی تھی۔ اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے اسی مسافحت کو بغاء یعنی زنا قرار دے کر اس سے مسلمانوں کو منع کیا ہے۔ اس صورت میں مسلمان لونڈیوں کی تخصیص کی معقول وجہ ذہن میں آ گئی۔

پھر لا تکرھوا فرمایا گیا۔ کیا فریب دے کر، لالچ دے کر راضی کر کے بغاء یعنی (بقول مفسرین) پیشہ کرانا جائز ہوگا؟ ہرگز نہیں۔ پھر اکراہ کے معنی

اس حدتک قرار دینا جس سے اضطرار کی نوعیت پیدا ہو جائے۔ یہ بھی صحیح نہیں۔ فریب دینا، لالچ دینا، اُس کو اس کی خواہش نفس سے بفعل خود مجبور کر دینا، ڈرانا، دھمکانا وغیرہ سب اکراہ میں داخل ہے۔ یہاں یہ کہا جارہا ہے کہ تم اپنی لونڈیوں کو (کسی طرح سے، کسی ترکیب کسی چال سے بھی، بغاء یعنی مسافحت یا اتخاذ الاخدان پر مجبور نہ کرو۔ کیوں کہ اگر تم چاہو گے کہ وہ بخوشی اور برضا و رغبت تمہاری فراش بنیں تو وہ ضرور اپنے نیک و بد کو سمجھ کر فراش بنیں گی اور سب سے پہلے وہ اپنا زرفدیہ ادا ہو جانے کی تدبیر سوچ کر محصنہ بننے کی راہ نکالیں گی۔ ان کا آقا جب تک زرفدیہ کو مہر قرار دے کر ان سے نکاح نہ کرے، اور نکاح کے بعد اُن کو آزاد نہ سمجھ لے اور بہ نیت احصان ان کو اپنی زوجیت میں نہ لائے۔ اُس وقت تک یہ کبھی رضا و رغبت سے اس کی فراش نہ بنیں گی۔ تو اگر اُن کی رضاء کے بغیر، زرفدیہ کو زر مہر قرار دیے بغیر، اُن کو آزاد اور محصنہ بنائے بغیر، محض شہوت رانی کے لیے ان کو فراش بنایا جائے گا، تو یہ یقیناً بالاکراہ (بجبر) ہی ہوگا، کبھی بالاستر ضا (رضامندی) نہ ہوگا۔ یہی وجہ ہوئی کہ لاتکرھوا فرمایا گیا، مگر علم الٰہی میں یہ ضرور تھا کہ عہد نبوی اور خلافت راشدہ کے بعد بہت جلد مسلمان بلکہ اُن کے علماء عہد جاہلیت کی اس ظالمانہ اور مسافحانہ رسم کو جھوٹی جھوٹی روایات کی بنا پر از سر نو زندہ کرلیں گے اور قرآنی آیاتِ کریمہ کو اُن روایات موضوعہ کا پابند کر کے ان کی غلط سلط تاویلیں کریں گے اور ضرور ان غریبوں کو اس ممنوع عنہ بغاء پر مجبور کریں گے، اس لیے فرمایا کہ وَمَنْ يُّكْرِههُّنَّ فَاِنَّ اللّٰهَ مِنْۢ بَعْدِ اِكْرَاهِهِنَّ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ یعنی جب یہ مجبور ہو کر اکراہ سے مغلوب ہو کر بغاء پر راضی ہو جائیں۔ کیوں کہ تحصّن اُن کے بس کی چیز نہیں ہے۔ جب تک کوئی محصنہ نہ بنائے، یہ تحصن کیوں کر اختیار کر سکتی ہیں۔ اس لیے اُن کے لیے اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔ ظاہر مطلب تو یہی ہے کہ لَهُنَّ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ اس لیے میں نے یہی لکھا کہ ان مجبور لونڈیوں کے لیے غفور رحیم ہے، مگر قرآن کی اس آیت میں لَهُنَّ کا لفظ نہیں ہے۔ اس میں بھی ایک رمز ہے۔ وہ یہ کہ کتنے لوگ آیندہ ایسے ہوں گے جو منافقین اور شہوت پرست ملحدین کی من گھڑت روایتوں کی وجہ سے دھوکا کھا کر اور ان روایات موضوعہ کو حق سمجھ کر باوجود صدق ایمان اور خلوص نیت اتباع احکام کے اس بغاء پر خود نادانستہ مجبور ہو جائیں گے اور ایک دور قرون مشہود لہا بالخیر (زمانہ نبوت سے قریب کی صدیاں)، کے بعد ایسا آئے گا کہ یہ لونڈیاں بے چاری ان روایات موضوعہ کے زور سے ہمیشہ کے لیے مجبور کر دی جائیں گی۔ اس لیے عام طور سے فرمایا گیا کہ فَاِنَّ اللّٰهَ مِنْۢ بَعْدِ اِكْرَاهِهِنَّ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ، یعنی مکرِہ تو قابل توجہ بھی قرار نہیں دیا گیا۔ زنا کے قریب جب جانا ممنوع ہے تو جو شخص کسی کو زنا پر مجبور کرے وہ کتنا بڑا مجرم ہو سکتا؟ اور اُس کی کیسی سخت سزا ہونی چاہیے؟ نہ یہ پوچھنے کی چیز تھی، نہ اس کے بیان کی ضرورت تھی۔ باقی رہیں وہ بے چاریاں جو مجبور کر دی گئیں تو بے شک یہ مستحق رحمت و مغفرت ہیں۔ مگر وہ بھی تو مجبوروں ہی میں ہیں، جن کو جھوٹی روایات اور من گھڑت تفسیرات سے مغلوب الایمان و مجبور العمل کر دیا، تو وہ محض نیک نیتی سے باوجود اپنی پختہ ایمانی کے اس بغاء کے نادانستہ مرتکب ہو گئے۔ اس لیے ضمناً اُن کی مغفرت کا پہلو بھی نکل آیا۔ اسی لیے لَهُنَّ کا لفظ آیت میں مذکور نہ ہوا۔ اگر مذکور کر دیا جاتا تو یہ پہلو جو ایک ضمنی پہلو ہے نہیں نکل سکتا۔ یہی سب نکتے ہیں جو قرآن کے کلام اللہ ہونے کی شہادت دے رہے ہیں کہ یہ کلام کسی عالم الغیب ہی کا ہو سکتا ہے کسی اور کا نہیں۔

استمتاع بالفراش بغیر احصان وابتغاء بالمال کے جائز نہیں

سورہ نساء رکوع چہارم آخر پارۂ چہارم و آغاز پارۂ پنجم میں حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ سے كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ تک اُن عورتوں کی فہرست بتا دی گئی جن سے نکاح کرنا حرام ہے۔ اس فہرست کو بتا کر ارشاد فرمایا گیا کہ وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ان محرمات سے تو استمتاع کر ہی نہیں سکتا۔ اُن کے سوا جس غیر مشرکہ سے کوئی مسلم استمتاع بالفراش کرنا چاہیے تو اُس کے لیے دو شرط ضروری ہے۔ ایک تو احصان، دوسرے ابتغاء بماله اور تیسری شرط سلبی ہے، یعنی یہ کہ مسافحت کا ارادہ نہ ہو۔

تو یہ بھی ظاہر ہے کہ ماوراء ذالکم میں اپنی لونڈیاں بھی داخل ہیں۔ اس لیے ان سے بھی استمتاع بالفراش بارادۂ احصان بلا ارادۂ مسافحت

اور بذریعۂ ابتغاء بمالہٖ ہی جائز ہو سکتا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ استمتاع بالفراش بلا ارادۂ احصان مسافحت ہے اور ہر مسافحت بغاء ہے (اسی لیے فرمایا گیا کہ لا تکرھوا فتیٰتکم علی البغاء ان اردن تحصناً) اور ہر بغاء زنا ہے اور فرمایا گیا: لا تقربوا الزنا۔ پھر لونڈی کے ساتھ استمتاع کا ابتغاء بالمال جب تک نہ ہو، احصان ناممکن ہے، یعنی ابتغاء بالمال ہی کے ذریعے اُس کو محصنہ بنایا جا سکتا ہے۔ مگر لونڈی چاہے جہاد کے ذریعہ زرفدیہ میں گرو ہو کر حاصل ہو یا بذریعہ خریداری یعنی دوسرے کے اسی معاملۂ گرو کو اپنی طرف منتقل کر کے حاصل کی جائے، اس کی بالکل وہی نوعیت ہے جو غلام کی ہے یعنی جس طرح غلام جہاد کے ذریعے حاصل کیا جاتا ہے، خریداری کے ذریعے حاصل کیا جاتا ہے، اُسی طرح لونڈی حاصل کی جاتی ہے۔ جہاد میں زرفدیہ لونڈی کے ذمے باقی رہتا ہے نہ کہ اُجرت استمتاع اُس کو کچھ دی جاتی ہے۔ خریداری میں وہ زرفدیہ جو بایع کا حق تھا اُس بایع کو دیا جاتا ہے، اُس لونڈی کو کچھ نہیں دیا جاتا۔ اس لیے بہر حال اُس کے ساتھ بغیر نکاح یعنی بغیر اعلانِ وصولی زرفدیہ واقامت تعلق ازدواجی اس سے فراش بلا ابتغاء بالمال ہوگا جو یقیناً آیت مذکورہ کے رو سے حرام ہی ہوگا۔

لونڈی سے نکاح کا حکم | سورہ نساء آیت ۳ میں ہے: فانکحوا ما طاب لکم من النساء مثنیٰ وثلث وربٰع۔ وان خفتم ان لا تعدلوا فواحدۃ او ما ملکت ایمانکم۔ ذالک ادنیٰ ان لا تعولوا۔ واٰتوا النساء صدقٰتھن نحلۃ ط اس آیت کریمہ میں نکاح کا حکم ہے جو فانکحوا سے ظاہر ہے۔ کس سے نکاح کرو۔ عام عورتوں سے یعنی محرمات کے سوا ہر اجنبی عورت سے نکاح کر سکتے ہو جو پسند آئے۔ ایک ایک، دو دو، تین تین، چار چار۔ بشرطیکہ ان میں عدل قائم رکھ سکو۔ اگر ڈرو کہ عدل نہ ہو سکیگا تو بس ایک ہی پر اکتفاء کرو۔ یا اپنی ملک یمین سے نکاح کر لو۔ یہ اس سے قریب تر ہے کہ تم مشقت میں نہ پڑو اور عام عورتوں سے نکاح کرو تو اُنہیں اُن کا زرمہر بکشادہ پیشانی ادا کرو۔ آیت مذکورہ کا بس صرف یہی صحیح ترجمہ ہے۔ اس کے سوا کوئی دوسرا صحیح ترجمہ نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ وما ملکت ایمانکم کا عطف دو ہی لفظ پر ہو سکتا ہے۔ یا تو ما طاب لکم من النساء پر عطف کیجئے یا صرف النساء پر۔ پہلی صورت میں تفسیر یوں ہوگی کہ او انکحوا ما ملکت ایمانکم اور دوسری صورت میں او انکحوا ما طاب لکم مما ملکت ایمانکم مگر بہر حال ما ملکت ایمانکم کا تعلق فانکحوا ہی سے ہوگا۔ اس لیے بغیر نکاح کے ملک یمین سے استمتاع کسی طرح بھی جائز نہیں ہو سکتا۔ جو لوگ او ما ملکت ایمانکم کے لیے ایک فعل مثلاً استمتعوا وغیرہ جداگانہ محذوف مانتے ہیں تاکہ فانکحوا کے اثر سے ملک یمین آزاد رہے وہ اتباع قرآن نہیں کرتے، بلکہ قرآن کو اپنے مفروضات کا متبع بنانا چاہتے ہیں۔

اور وہ لوگ جو ما ملکت ایمانکم کو فانکحوا کے ماتحت تو مانتے ہیں مگر اس سے اپنے سوا کسی دوسرے کی ملک یمین مراد لیتے ہیں۔ کیوں کہ اُن کے نزدیک تو اپنی ملک یمین کو بلا نکاح فراش بنانے کا حق حاصل ہی ہے۔ پھر اُن سے نکاح کا حکم کیوں ہوگا۔ اس صورت میں بھی وہی الزام عائد ہوتا ہے کہ یہ خود قرآن کا اتباع کرنا نہ ہوگا۔ بلکہ قرآن کو اپنے مفروضات کا متبع بنانا ہوگا۔ اس لیے کہ یہ تاویل ایک ایسی وجہ سے کی جا رہی ہے جس کی کوئی دلیل قرآن سے نہیں مل سکتی۔ پھر یہ تاویل خلاف سیاق قرآن بھی ہے۔ اور خلافِ محاورۂ عرب بھی۔ یہ غیر ممکن ہے کہ اباءکم سے اپنے باپ مراد نہ ہوں، دوسروں کے باپ مراد ہوں، اخوانکم سے اپنے بھائی مراد نہ ہوں بلکہ دوسروں کے بھائی مراد ہوں وقس علی ھذا۔ ہاں جس کا باپ زندہ نہ ہو جس کا بھائی زندہ نہ ہو، اور طرز کلام عموم کا افادہ کر رہا ہو تو پھر وہ دوسروں کے باپ بھائی کو مراد لے لے، یہ ہو سکتا ہے، ورنہ بخوبی ممکن ہے کہ دوسروں کے باپ بھائی مراد نہ ہوں جیسا کہ آیت محرمات میں حرمت علیکم اُمّھٰتکم وبناتکم واخواتکم میں خاص اپنی ہی ماں بیٹی بہن وغیرہ مراد ہیں دوسروں کی نہیں۔ مگر یہ غیر ممکن ہے کہ اپنی مراد نہ ہوں اور دوسروں کی مراد ہوں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ یہاں او ما ملکت ایمانکم میں اپنی ملک یمین مراد نہ ہو، اور دوسروں کی ملک یمین مراد ہو۔ اس لیے یہ تاویل یقیناً خلاف محاورۂ عرب ہوگی۔

ذالک ادنیٰ ان تعولوا کا اشارہ یقیناً اسی ملک یمین کے ساتھ نکاح کرنے کی طرف ہے۔ اس لیے کہ آزاد عورت سے نکاح کرنے کے لیے زرمہر مہیا کرنے کی زحمت اٹھانا پڑے گی جو یقیناً باعث مشقت ہے۔ اپنی ملک یمین سے نکاح کر لینے میں اس مشقت سے بالکل نجات ہے۔

اس لیے کہ ایک پیسہ بھی دینا نہیں پڑتا۔ جو زرفدیہ اُس کے ذمے واجب الادا ہے۔ وہی زرمہر بن کر بے باق ہو جاتا ہے۔ آقا کو بلا مشقت ایک بی بی مل جاتی ہے اور لونڈی بآسانی آزاد ہو کر اپنے آقا کی محصنہ بی بی بن جاتی ہے، دونوں کے لیے بہتری اور سہولت ہے۔ اس لیے ذالک ادنیٰ ان لا تعولوا کا تعلق او ما ملکت ایمانکم کے سوا اور کسی فقرے کے ساتھ صراحتاً غلط ہے اور بداہتہً لغو۔

جن لوگوں نے ذالک ادنیٰ ان لا تعولوا کا تعلق فواحدۃً سے قائم کرنا چاہا ہے، اُنھوں نے قرآن مجید کی صاف اور ستھری عبارت کو خواہ مخواہ گنجلک کر کے فصاحت کی گردن پر چھری چلائی ہے۔ قرآن پاک کی اس آیت میں ایک مکمل جملہ معطوفہ یوں ہے: فانکحوا ما طاب لکم من النساء مثنیٰ وثلٰث وربٰع او ما ملکت ایمانکم۔ اس کے بعد ایک جملہ مستانفہ ہے، ذالک ادنیٰ ان لا تعولوا۔ اور وان خفتم ان لا تعدلوا فواحدۃ۔ گویا ایک جملۂ معترضہ تھا جو اُس جملہ معطوفہ کے دونوں اجزاء معطوف علیہ اور معطوف کے درمیان آگیا تھا جس کا تعلق صرف مثنیٰ وثلٰث وربٰع سے تھا، یا "مثنیٰ وثلٰث وربٰع" سے۔ "وان خفتم ان لا تعدلوا فواحدۃ" تک کو بطور جملہ معترضہ کے قرار دے دیجئے۔ اس لیے کہ اصل تو حکم فانکحوا ما طاب لکم من النساء او ما ملکت ایمانکم ہے۔ اب صرف من النساء کی تفصیل مثنیٰ وثلٰث وربٰع کی اجازت مشروط بعدل دی گئی۔ عدم عدل کا خوف ہو تو ایک سے بڑھنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ اس لیے اگرچہ نحوی ترکیب سے ان کو جملہ معترضہ نہیں کہا جاسکتا مگر معنوی حیثیت سے یہ جملہ معترضہ ہی ہیں۔ یہی وجہ ہوئی کہ میں نے گویا جملہ معترضہ اور "بطور جملہ معترضہ" کے الفاظ لکھے تو اگر ذالک ادنیٰ ان لا تعولوا کا تعلق معطوف علیہ سے تھا تو اُس کو پھاند کر معطوف کے بعد آنے کی کیا وجہ ہوئی۔ اگر وان خفتم ان لا تعدلوا فواحدۃ۔ ذالک ادنیٰ ان تعولوا۔ او ما ملکت ایمانکم کہا جاتا تو عبارت میں کون سی خرابی پیدا ہو جاتی؟ بلکہ عبارت واضح ہو جاتی۔ اس لیے معطوف علیہ سے جو جملہ یا فقرہ متعلق ہو، اُس کو معطوف کے بعد آنا بالکل خلاف فصاحت ہے۔ خصوصاً جہاں اس کا شبہ موجود ہو کہ اس کا تعلق معطوف علیہ کی جگہ معطوف سے سمجھا جائے گا۔

مطلب یہ ہے کہ ذالک ادنیٰ ان لا تعولوا کا تعلق واضح اور مقتضائے فصاحت و بلاغت کے مطابق "ما ملکت ایمانکم" ہی سے ہے۔ ہرگز "فواحدۃ" سے نہیں ہے۔ پھر "تعولوا" کو عیال سے مشتق قرار دینا اور یہ مطلب لینا کہ اگر ایک ہی پر اکتفا کرو گے تو تم عیال والے نہ ہو سکو گے یعنی کثرت عیال سے پریشان نہ ہو گے۔ خواہ مخواہ کی کھینچ تان ہے، "لا تعولوا" کے معنیٰ "کثرت عیال والے نہ ہو گے" کسی طرح بھی نہیں ہو سکتے۔ باقی رہا "جور و میل" کے معنی لے کر یہ مطلب نکالنا کہ اگر ایک ہی کرو گے تو "تم ظلم و جور نہ کر سکو گے یا کسی ایک طرف مائل نہ ہو سکو گے"۔ یہ بھی بے جوڑ ہی ہے۔ جور و میل سے بچنے کی ترکیب تو وہیں بتائی جاسکتی ہے جہاں جور و میل کا امکان ہو۔ جب ایک ہی بی بی ہے تو پھر وہ نہ عدل ہی کر سکتا ہے نہ جور و میل ہی کر سکتا ہے۔ اس لیے عدل جس طرح کم سے کم دو کے درمیان کرے گا اسی طرح جور و میل کے لیے بھی کم سے کم دو کی ضرورت ہے۔ سرے سے شادی ہی نہ کرے تو اور زیادہ جور و میل سے محفوظ رہ سکے گا ؂

فیل ہونے کا نہ کھٹکا، پاس کرنے کی نہ فکر　　امتحاں ہی تم نہ دو، لاکھ آئے وقتِ امتحاں

مختصر یہ ہے کہ ذالک ادنیٰ ان لا تعولوا جس طرح لفظاً او ما ملکت ایمانکم کے بعد متصل آیا ہے، اسی طرح مفہوم کے اعتبار سے بھی اس کو ما ملکت ایمانکم ہی سے اتصال تام ہے اور جو فقرہ معطوف کے بعد آیا ہے، کوئی وجہ نہیں کہ خواہ مخواہ اُس کو معطوف علیہ سے متعلق قرار دے دیا جائے۔ پھر بقاعدۂ وصل و فصل بھی اُس کا تعلق معطوف ہی سے ہو گا، ورنہ واؤ عطف ضرور آتا۔

واٰتوا النساء صدقٰتھن نحلۃ۔ اس واؤ عطف نے بتا دیا کہ اس کا تعلق اوپر سے ہے، اُس جملے سے نہیں ہے۔ جس کے بعد یہ آیا ہے ورنہ واؤ عطف نہ آتا۔ پہلے فانکحوا ما طاب لکم من النساء کا ذکر ہے۔ اب چاہے وہ متعدد ہوں یا ایک، انھیں اُن کا زرمہر خندہ پیشانی کے ساتھ ادا کر دینا چاہیے۔ اس فقرے نے بھی بتا دیا کہ ذالک ادنیٰ ان لا تعولوا کا تعلق ما ملکت ایمانکم سے ہے۔ یعنی اگر اپنی ملک یمین موجود

ہو تو بلاخوفِ مشقت یعنی بلا ادائے زرمہر اُن سے نکاح کر لو۔ ورنہ اجنبی عورت سے نکاح کروگے تو چاہے وہ دوسرے کی مِلکِ یمین ہی کیوں نہ ہو
اُس کو اُس کا زرمہر ضرور ہنسی خوشی دے دو۔ مختصر یہ ہے کہ یہ آیت اپنی لونڈیوں سے نکاح ہی کرنے کے لیے نص صریح ہے۔

ازواج اور مِلکِ یمین کا فرق حقیقت کے اعتبار سے تو دونوں ہی منکوحہ ہیں۔ مگر اجنبی عورت سے نکاح کے لیے اُس کی یا اُس کے ولی کی اجازت، پھر تعیین زرمہر اور سعی ادائے زرمہر و اعلان کی شرطیں ضروری ہیں اور اپنی مِلکِ یمین سے نکاح کرنے کے لیے نہ کسی سے اجازت کی ضرورت، نہ زرمہر کی تعیین کی ضرورت، نہ سعی ادا کی ضرورت۔ صرف اُس مِلکِ یمین کو اطلاع اور اعلان کی ضرورت ہے اور بس۔ ہاں اگر اطلاع کے بعد وہ فراش بننے سے انکار کرے اور مکاتبت کی درخواست کردے تو پھر اُس کو فراش بنانا جائز نہ ہوگا۔ اگر وہ مکاتبت کی درخواست نہ کرے بلکہ کہنے سے بھی مکاتبت نہ کرائے تو پھر اطلاع و اعلان کے بعد فراش بنا سکتا ہے۔ بس یہی فرق دونوں کے نکاح میں ہے۔ مگر اُس کے بعد یعنی اطلاع و اعلان کے بعد وہ آزاد ہو گئی۔ اُس کا فدیہ ادا ہو گیا۔ اور اب یہ عام ازواج[1] کی طرح ازواج میں داخل ہے۔ چاہے عرف عام میں اُس کو مِلکِ یمین ہی کہا جایا کرے۔ جس طرح آج ہندوستان میں بیاہی بیوی اور نکاحی بیوی کا فرق و امتیاز موجود ہے۔ مگر حقیقتاً اور شرعاً کوئی فرق نہیں۔ ولا مناقشۃ فی الاصطلاح۔ قرآن نے عرف عام کا خیال کرتے ہوئے اس اصطلاح کو قائم رکھا اور بس۔

البتہ بعض امور میں عام ازواج اور مِلکِ یمین میں کچھ فرق ضرور ہے جس میں انھیں مِلکِ یمین کے لیے کچھ سہولتیں مدنظر ہیں۔ مثلاً عام نساء کے لیے تو مثنیٰ و ثلاث و ربٰع فرمایا گیا اور پھر وان خفتم ان لا تعدلوا فواحدۃ۔ مگر ان کے متعلق نہ کوئی تعداد معین کی گئی نہ عدل کی شرط لگائی گئی جس کی وجہ سے لوگوں نے سمجھ لیا کہ متعدد مِلکِ یمین ہوں تو ان میں عدل کرنا مطلقاً ضروری نہیں۔ حالانکہ عدل کا تو عام حکم ہے۔ فرمایا گیا کہ اعدلوا ھو اقرب للتقوٰی۔ تو سارے جہان کے ساتھ تو عدل کا حکم ہو مگر مِلکِ یمین سارے جہان سے مستثنیٰ قرار دے دی جائیں۔ یہ ایک عجیب بات ہے۔ اس لیے ضرور مِلکِ یمین اگر متعدد ہوں تو ان میں بھی عدل ضروری ہے۔ بلکہ زوجہ اور مِلکِ یمین منکوحہ ہو تو ان میں بھی عدل لازم ہے۔ کیوں کہ اب وہ محض اصطلاحاً مِلکِ یمین ہے۔ ورنہ وہ تو آزاد محصنہ ہے اور درحقیقت زوجہ ہی ہے۔ پھر فرق کر کے خواہ مخواہ انسانی مساوات کا خون کرنا شرعاً جائز کیوں تسلیم کیا جائے؟

البتہ ان کی تعداد معین[2] نہیں کی گئی۔ صرف اس لیے کہ جتنی مِلکِ یمین بھی نکاح میں آئیں گی، سب کی سب آزاد ہی[3] ہو جائیں گی اور سب کا زرِ فدیہ زرمہر ان کو ادا ہو جائے گا، اس لیے فک رقبۃ کی ایک صورت یہ بھی ہے۔ اُس کو محدود کیوں کر دیا جائے۔ نکاح کرنے والا آخر کتنوں کو اپنے مصرف میں رکھے گا۔ جس جس سے طبیعت سیر ہو جائے گی طلاق[4] دے کر آخر اُس کو آزاد کر ہی دے گا۔ کیوں کہ فقد ردھا کالمعلقۃ

---

[1] اس صورت میں ان کی تعداد بھی چار سے زیادہ نہ ہوگی۔ (مدیر)

[2] یہ بات خلاف حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ مثنیٰ و ثلاث و ربٰع کی قید لونڈیوں پر کیوں عائد نہیں ہو سکتی، حالاں کہ اُن کے ساتھ نکاح کرنے کی اجازت بھی اسی آیت میں موجود ہے۔ یہ کہیں ثابت نہیں ہوتا کہ وہ اس تعداد سے مستثنیٰ کر دی گئی ہیں۔ (مدیر)

[3] لفظاً شاید آزاد ہو جائیں۔ معناً و حقیقتاً سوتیا ڈاہ کی سنگین قید میں پھنس کر جہنم واصل ہو جائیں گی۔ (مدیر)

[4] کھیل بچوں کا ہوا امرِ شریعت نہ ہوا ـــــ آپ ان کو نکاح کے ساتھ ہی "آزاد محصنہ" اور درحقیقت ازواج ہی میں داخل تسلیم فرماتے ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے تو "آزاد محصنہ ازواج" کی طرح ان کو چار تک محدود کیوں نہ رکھا جائے ـــــ ایک طرف ان کو بھیڑوں کے گلے کی طرح ایک گڈریے کی ماتحت جائز ماننا، دوسری طرف اس کو تمام خصوصیات نسوانی کا حامل سمجھنا، یہ ماحول کی تاثیر ہے جس سے سقراط و فلاطون بھی نہ بچ سکے۔ اللّٰھم اھدنا الصراط المستقیم۔ (مدیر)

کے مطابق اُس کو بالکل معلق چھوڑ کر تو رکھے گا نہیں۔ وہ اس سے آزاد ہوکر اپنی دوسری راہ نکال لیں گی، مگر غلامی کی قید تو رہائی پا جائیں گی۔

ملک یمین کو بلا نکاح فراش بنانے کی سب سے بڑی مگر واحد دلیل

پارہ (۱۸) سورہ مومنون کے شروع ہی میں ہے اور سورۂ معارج پارہ (۲۹) کے پہلے ہی رکوع میں وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حٰفِظُوْنَ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝ یہاں ازواج اور ملک یمین کے سوا تمام مخلوق سے حفاظت فروج کا حکم ہے اور ان دو کے سوا سب سے ابتغاء استمتاع حرام قرار دیا گیا۔ اسی آیت سے جلق مارنے کی حرمت بھی نکلتی ہے۔

غرض چوں کہ ازواج اور ملک یمین سے حفاظت فروج کا حکم نہیں اس لیے سمجھ لیا گیا کہ ملک یمین سے یہاں بلا نکاح مراد ہے، انھیں تفسیروں میں ہے کہ حضرت فاروق اعظم کے عہد میں کسی عورت نے اپنے غلام سے تعلقات قائم کر لیے تھے۔ جب استفسار ہوا تو اُس نے یہی آیت پیش کی اور "والذین" کو عورت مرد سب کے لیے عام قرار دے کر الا علی ازواجھم او ما ملکت ایمانھم کو بھی عام ہی قرار دیا کہ جس طرح مرد اپنی بیویوں اور لونڈیوں سے حفاظت فروج نہیں کرے گا، اسی طرح عورت بھی اپنے شوہروں اور غلاموں سے حفاظت فروج نہیں کرے گی۔ عموم لفظ سے یہ ناجائز فائدہ اُٹھایا گیا۔ میں تو اس قسم کی لغو روایتوں کو سرے سے تسلیم ہی نہیں کرتا۔ خصوصاً جب کہ یہ روایت محمد بن بشار المعروف بہ "بندار" سے ہے جن کے متعلق تہذیب التہذیب میں ہے کہ عمرو بن علی یحلف ان بندارا یکذب اور علی بن المدینی نے بھی ان کی روایت فی السحور برکۃ کو سن کر کہا تھا ھذا کذب وانکرہ اشد الانکار اور بندار اس حدیث کو عبد الاعلی بن عبد الاعلی سے روایت کرتے ہیں، جو قدری المذہب اور ضعیف تھے۔ تہذیب التہذیب میں ہے: "کان قدریا۔ ولم یکن بالقوی"۔ اور اس روایت کے متعلق خود ابن کثیر نے لکھا ہے کہ "ھذا اثر غریب منقطع ذکرہ ابن جریر فی تفسیر اول سورۃ المائدہ" بہر حال جو لوگ اس قسم کی روایتوں پر اور اس روایت پر ایمان رکھتے ہیں، اُن کو غور کرنا چاہیے کہ ہر جگہ عموم لفظ سے فائدہ اُٹھانے کی سعی بعض وقت کتنی خطرناک ہو جاتی ہے۔ درحقیقت یہ آیت مردوں ہی کے لیے ہے، اس لیے کہ عورتیں تو اپنی فطری شرم و حیا کی وجہ سے حفاظت فروج کرتی ہیں۔ دوسرے ابتغاء یعنی ابتغائے استمتاع بھی مردوں ہی کی طرف سے ہوتا ہے۔ مرد اگر مبتغی نہ ہو تو صرف عورت ابتغا نہیں کر سکتی۔ بخلاف عورتوں کے، کہ اُن کی طرف سے ابتغاء نہ ہو، جب بھی مرد اُن کے ساتھ جبراً ابتغاء کر سکتا ہے۔ اس لیے فمن ابتغی وراء ذلک ...... بتا رہا ہے کہ مخاطبت یہاں مردوں ہی کی طرف ہے۔ البتہ اس آیت کے جس جس حصہ کے مضمون میں

٭ ایک عزیز ترین حبیب نے اس بحث کو اول سے آخر تک دیکھ لینے کے بعد فرمایا کہ اس میں شک نہیں کہ دلائل بہت زبردست ہیں مگر چوں کہ روایات اور تعامل سے یہ ثابت ہے کہ لونڈیاں بلا نکاح ہمیشہ فراش بنائی گئیں اور یہی آیت اس کے لیے نص قطعی برابر سمجھی جاتی رہی تو یہ ساڑھے تیرہ سو برس کا فہم و تعامل بالکل غلط کیوں کر ہو سکتا ہے؟ خصوصاً جب عہد نبوی و عہد خلفائے راشدین سے اس کا فہماً و عملاً سلسلہ جاری ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کے معانی کو جس طرح عکرمہ و سدی مجاہد و مقاتل و قتادہ وغیرہم نے خود ساختہ من گھڑت تفسیری روایتوں سے خبط ربط کرنے کی کوشش نامسعود کی، اسی طرح کتنے راویانِ سنن نے تعامل عہد نبوی و عہد خلفاء کو بھی خلاف واقعہ صورت میں ثابت کرنے کی برابر زبردست جد و جہد کی اور فقہ کی کتابیں قرآن کی بنا پر بہت کم، زیادہ تر انھیں روایات و حکایات کی بنا پر مدون ہوئیں، اس لیے خلفائے عباسیہ میں دین اسلام کی بالکل صورت ہی بدل دی گئی۔ نئے نئے معتقدات پیدا ہوئے، نئے نئے طریقے کی عبادتیں پیدا ہوئیں اور حقوق و معاملات میں تو ایسے ایسے تغیرات پیدا ہوئے کہ درحقیقت دین بالکل مسخ ہو کر رہ گیا۔

اب وہ خیالات جو بچپن سے ہمارے قلوب میں جمے ہوئے ہیں۔ کتابوں میں پڑھتے رہے، لوگوں سے سنتے رہے۔ ان کے خلاف ہزارہا واضح سے واضح دلائل ملیں، مگر دل ہے کہ جمے ہوئے خیال سے چمٹا ہوا ہے۔ اگر کچھ دنوں اور یہ مسئلہ زیر غور رہے گا اور قرآنی آیات سامنے آتی رہیں گی اور وہ حصہ مضمون جو روایات سے متعلق ہے وہ بھی سامنے آجائے گا تو پھر ان شاء اللہ تعالیٰ "رشد" "غی" سے متبین ہو جائے گا۔ وباللہ التوفیق۔ ۱۲ منہ عفی عنہ

جہاں ضمناً عورتیں بھی مراد لی جاسکتی ہیں وہاں عورتیں بھی داخل کبھی جائیں تو کوئی مضائقہ نہیں ہے، مثلاً ھم لفروجھم حٰفظون الا علیٰ ازواجھم تک میں عورتیں بھی شامل ہوسکتی ہیں۔ مگر اس کی خواہ مخواہ ضرورت بھی نہیں۔ اس لیے کہ وَالْحٰفِظِیْنَ فُرُوْجَھُمْ وَالْحٰفِظٰتِ میں عورت اور مرد دونوں کا ذکر حفاظت فروج کے متعلق موجود ہے۔ اگر کہا جائے کہ یہاں ازواج کو مستثنیٰ نہیں کیا گیا ہے تو یہ استثنا عقلاً و درایۃً موجود ہے۔ مردوں کے لیے تو یہ سورہ مومنون ومعارج والی آیتیں یہاں تفسیر کا کام دیں گی اور پھر جو ان میں عورتوں کا بھی ضمناً شمول ہے، خصوصاً علیٰ ازواجھم کے لفظ سے، تو انھیں آیتوں سے یہاں عورتوں کے لیے بھی شوہروں کا مستثنےٰ ہونا ثابت ہے۔

قرآن مجید میں "ازواج" کا لفظ تجوزاً منگیتر پر بھی استعمال ہوا ہے، یعنی جس سے گفتگوئے نکاح ہو رہی ہے، قبل نکاح اُن کو ازواج کہہ دیا گیا۔ مثلاً سورہ بقرہ کے رکوع ۳۰ کی ابتدا ہی میں فرمایا گیا ہے: فَلَا تَعْضُلُوْھُنَّ اَنْ یَّنْکِحْنَ اَزْوَاجَھُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَیْنَھُمْ بِالْمَعْرُوْفِ۔ تو کیا وہ اپنے منگیتروں سے بھی حفاظت فروج نہ کریں گی؟ اسی طرح حَتّٰی تَنْکِحَ زَوْجًا غَیْرَہٗ میں جس سے وہ نکاح کرے گی، ابھی نکاح نہیں کیا ہے مگر اُس کو اس کا "زوج" کہہ دیا گیا۔ پھر وَبُعُوْلَتُھُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّھِنَّ میں طلاق دینے والے مرد کو طلاق دینے کے بعد بھی "بعل" یعنی شوہر کہا گیا۔ تو اگر ایسا ہی عموم لفظ سے فائدہ اٹھانا ہے تو قبل نکاح منگیتروں سے اور طلاق کے بعد بھی طلاق دینے والے شوہروں سے باوجود عدم رجوع عن الطلاق کیا عورتیں حفاظت فروج نہ کریں گی؟ یا وہ مرد اُن عورتوں سے حفاظت فروج نہ کریں گے؟ ہرگز نہیں۔

خلاصہ مطلب یہ ہے کہ قرآن میں "ازواج" اور "بعولۃ" کا لفظ شوہروں، اور ہونے والے شوہروں، اور سابق شوہروں، سب کے لیے استعمال ہوا ہے۔ مگر یہاں حفاظت فروج کا حکم مردوں کو دیا گیا ہے تو اُس سے مستثنیٰ اُن کو اُنھیں عورتوں سے متعلق کیا گیا ہے جن سے وہ نکاح رکھتے ہیں اور اس وقت جن کے شوہر ہیں نہ یہ کہ وہ جن کے منگیتر ہیں، یا جن کو طلاق دے چکے ہیں اور مدت رجعت بھی گزر چکی ہے۔ اسی طرح ملک یمین سے بھی وہی ملک یمین مراد ہوگی جس سے وہ نکاح کر چکے ہیں اور وہ از روئے نکاح اُن کی محصنہ بن چکی ہے۔ ورنہ اگر عموم لفظ سے ناجائز فائدہ اٹھایا جائے گا۔ تو گذشتہ تصریحات سے ثابت ہو چکا ہے کہ اس سے کیا کیا خرابیاں پیدا ہوسکتی ہیں۔

ازواج کے ساتھ مذکور ہونے سے بلا نکاح نہیں سمجھا جاسکتا سورۂ مومنون وسورۂ معارج کی اس آیت میں چوں کہ ازواج کے ساتھ ما ملکت ایمانھم کا ذکر آگیا ہے اس لیے ملک یمین کو بلا نکاح استعمال فروج کا محل قرار دینا ہرگز صحیح نہیں، اس کی دلیل ایک یہ بھی ہے، سورہ احزاب آیت ۵۰ میں ہے: یٰۤاَیُّھَا النَّبِیُّ اِنَّاۤ اَحْلَلْنَا لَکَ اَزْوَاجَکَ الّٰتِیْۤ اٰتَیْتَ اُجُوْرَھُنَّ وَمَا مَلَکَتْ یَمِیْنُکَ مِمَّاۤ اَفَآءَ اللّٰہُ عَلَیْکَ وَبَنٰتِ عَمِّکَ وَبَنٰتِ عَمّٰتِکَ وَبَنٰتِ خَالِکَ وَبَنٰتِ خٰلٰتِکَ الّٰتِیْ ھَاجَرْنَ مَعَکَ۔ اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا گیا ہے کہ تمہارے لیے تمہاری وہ بیبیاں جن کا مہر تم ادا کر چکے ہو اور تمہاری ملک یمین اور چچیری، پھپھیری، ممیری اور خلیری وہ بہنیں جو تمہارے ساتھ ہجرت کر چکی ہیں اُن سب کو ہم نے تمہارے لیے حلال کیا ہے تو کیا صرف ازواج کے ساتھ مذکور ہونے کی وجہ سے نعوذ باللہ یہ سب حلال ہو جائیں گی؟ تو جب چچیری پھپھیری ممیری بہنیں بلا نکاح حلال نہ ہوں گی تو پھر ملک یمین کیوں بلا نکاح حلال ہو جائیں گی؟ یہ کیا زبردستی ہے کہ جس کا ذکر ازواج کے ساتھ ہو وہ بلا نکاح محل استمتاع بن جائے؟

محاورے میں ملک یمین کا استعمال یہ لفظ بھی "ازواج" کی طرح کئی معنی میں مستعمل ہے یعنی جس طرح منگیتر کو بھی زوج کہتے ہیں، طلاق دیے ہوئے شوہر کو بھی زوج کہتے ہیں، حالانکہ درحقیقت یہ دونوں نہ اس وقت زوج ہیں نہ زوج کے احکام ان پر پوری طرح عائد ہیں۔ مگر مجازاً زوج کہہ دیے جاتے ہیں۔ اسی طرح ملک یمین بھی ہے کہ جب اس سے نکاح ہو چکا۔ اس کے ذمہ کا فدیہ مہر بن کر ادا ہو چکا، تو اب یہ آزاد محصنہ[۲] ہے اور درحقیقت ازواج[۳]

---

[۱] اس آیت کا ترجمہ یوں بھی کیا گیا: (گذشتہ آیت کے مطابق ان کے خاوند نہیں رکھ سکتے ہیں) رشتہ دارو تم ان عورتوں کو اپنے خاوندوں کے ساتھ نکاح رکھنے سے نہ روکو۔ (بیانٌ للنّاس) مدیر

[۲] [۳] آزاد محصنہ ازواج" چار سے زاید ہرگز جائز نہیں (مدیر)

ہی میں داخل ہے۔ مگر چوں کہ یہ پہلے ملک یمین تھی، اس لیے اس کو ملک یمین کہتے ہیں۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ اب نکاح کے بعد بھی اس پر ملک یمین کے تمام احکام نافذ کیے جائیں گے اور وہ حقیقۃً نکاح کے بعد بھی ملک یمین ہی باقی ہے۔ اسی اعتبار سے اِلَّا عَلٰٓی اَزۡوَاجِہِمۡ اَوۡ مَا مَلَکَتۡ اَیۡمَانُہُمۡ میں وہی مجازی ملک یمین مراد ہے جو اب نکاح کی وجہ سے آزاد محصنہ بن چکی ہے، مگر پہلے ملک یمین تھی نہ کہ ہر ملک یمین۔ چاہے اُس سے نکاح ہوا ہو یا نہ ہوا ہو۔

ملک یمین نکاح کے بعد آزاد ہو جائے گی قرآن مجید میں حکم ہے کہ وَاَنۡکِحُوا الۡاَیَامٰی مِنۡکُمۡ وَالصّٰلِحِیۡنَ مِنۡ عِبَادِکُمۡ وَاِمَآئِکُمۡ[۱] دیکھیے یہاں مَا مَلَکَتۡ اَیۡمَانُکُمۡ کا لفظ نہیں فرمایا گیا۔ اس لیے کہ ملک یمین کا لفظ تو عام ہے، جن کا نکاح ہو گیا اور وہ نکاح کے بعد اپنا زرفدیہ مہر میں ادا کر چکیں وہ بھی مجازاً ملک یمین کہی جاتی ہیں۔ اس لیے یہاں عبادکم وامائکم ارشاد ہوا۔ تاکہ غیر نکاح شدہ ہی مراد ہوں۔ جس ملک یمین سے آقا خود نکاح کر چکا، پھر کسی دوسرے سے جب تک طلاق نہ دے دے نکاح نہیں کر سکتا اور طلاق کے بعد بھی اُس عورت کو اختیار ہے کہ وہ جس سے چاہے نکاح کرے، اس لیے کہ اب تو وہ آزاد ہے، اُس کا زرفدیہ مہر میں محسوب ہو کر ادا ہو چکا، تو پھر وہ اب ملک یمین لونڈی نہیں رہی۔ طلاق پا چکی اس کے بعد منکوحہ نہیں رہی۔

اور اگر آقا نے اس کا نکاح کسی دوسرے شخص سے کر دیا تو شوہر سے زرمہر یہ خود وصول کرے گی اور شوہر اسی کو مہر ادا کرے گا۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ہے: فانکحوھن باذن اھلھن واٰتوھن اجورھن بالمعروف محصنٰت غیر مسٰفحٰت[۲]۔ اس آیت میں نکاح کو تو آقا کی اجازت پر موقوف رکھا، اس لیے کہ زرمہر کی تعیین وغیرہ وہی کرے گا۔ چونکہ وہی زرمہر اس کو زرفدیہ کی حیثیت سے وصول ہوگا۔ اگر مہر تخمینۂ فدیہ سے کم ہوگا تو اُس کا نقصان ہوگا۔ اسی لیے باذن اھلھن فرمایا گیا۔ مگر وہ زرمہر دیا جائے گا اسی ملک یمین کے ہاتھ میں، کیونکہ کہا گیا ہے، واٰتوھن اجورھن بالمعروف تاکہ وہ ملک یمین زرمہر کو خود لے کر آقا کو اپنے زرفدیہ کی حیثیت سے ادا کرے اور یہ اُسی پر فرض ہے، کیوں کہ فرمایا گیا ہے، محصنٰت غیر مسٰفحٰت اگر وہ زرفدیہ ادا کر کے آقا کی غلامی سے آزاد نہ ہو جائے گی تو اپنے شوہر کی محصنہ نہیں بن سکے گی۔ یہ غیر ممکن ہے کہ وہ لونڈی تو رہے آقا کی اور محصنہ ہے اپنے شوہر کی۔ غلامی سے بڑھ کر حصن حصین اور کیا ہو سکتا ہے۔ ایک عورت دو دو طرح کے حصن میں کس طرح رہے گی؟ اسی لیے یہاں "محصنین غیر مسافحین" نہیں فرمایا گیا، بلکہ محصنٰت غیر مسافحت فرمایا گیا۔ تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ وہ ملک یمین خود اپنے شوہر کی محصنہ بننے کی سعی کرے۔ چاہے وہ شوہر اُس کا آقا ہی ہو یا کوئی دوسرا شخص جس نے اُس کے آقا کی اجازت سے اُس سے نکاح کیا ہو۔ یہ کسی کی بھی محض شہوت رانی کا

---

[۱] [۲] ان دونوں آیتوں سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ آزاد کیے بغیر بھی لونڈی غلام یا لونڈی اور آزاد مرد کا نکاح ہو سکتا ہے، بدلائل ذیل پہلے فرمایا، اپنے صلاحیت والے لونڈی غلاموں کے نکاح کرا دو۔ یعنی بلحاظ عمر وصحت وغیرہ قابل نکاح ہوں۔ اس کے ساتھ ہی فرمایا جو نکاح نہ پائیں وہ غنی ہونے تک عفت اختیار کریں۔ ان دو باتوں کے بعد ایک تیسری بات جو الگ ہے، بیان فرمائی، والذین یبتغون الکتٰب الخ اور تمہارے لونڈی غلاموں میں سے جو لوگ کتابت (آزادی) طلب کریں تو تم ان میں خیر دیکھو تو لکھ دو۔ صدقہ وغیرہ سے اور خدا کے دیے ہوئے مال سے ان کی مدد کرو۔ یہاں نکاح کے لیے اور کتابت کے لیے خیر و صلاحیت دو الگ الگ ہو جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک دوسرے سے کوئی لزومی تعلق نہیں۔ دوسری آیت وانکحوھن الخ میں ہے کہ جو شخص آزاد عورت سے شادی بیاہ کا بار نہ اٹھا سکتا ہو وہ کسی کی لونڈی سے اس کے مالک کا اذن پا کر نکاح کر لے۔ لیکن لونڈی سے نکاح کرنے کی نسبت صبر کرنا بہتر ہے (وَاَنۡ تَصۡبِرُوۡا خَیۡرٌ لَّکُمۡ) یہ اس لیے کہا گیا ہے کہ لونڈی کا پاؤں دو کشتیوں میں ہوگا۔ اِدھر ایک شخص کی بیوی اُدھر دوسرے کی لونڈی۔ دونوں کے حقوق بیک وقت اس کے ذمے ہیں، جن سے عہدہ برآ ہونا مشکل بلکہ غیر ممکن ہے۔ ایسے نکاح کی اجازت صرف ان لوگوں کو ہے جن کو کسی مصیبت، مرض گناہ، زنا وغیرہ میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہو۔ (ذٰلِکَ لِمَنۡ خَشِیَ الۡعَنَتَ مِنۡکُمۡ) نیز لونڈیوں کو ارتکاب فاحشہ پر نصف سزا کی وجہ بھی یہی معلوم ہوتی ہے کہ وہ نکاح کے بعد بھی لونڈی ہے اور آزاد محصنہ کی نسبت غیر محفوظ۔ واللہ اعلم بالصواب (مدیر)

ذریعہ نہ بنے، یہ بہت باریک نکتہ ہے۔ دوسری جگہ محصنین غیر مسافحین آیا ہے۔ یعنی مردوں کو کہا گیا کہ جس سے بھی نکاح کرو تو اس کو محصنہ بنانے کے لیے محض شہوت رانی کے لیے نہیں اگر یہاں اُن لونڈیوں کو کہا گیا کہ تم محصنہ بن کر کسی کی فراش بنو۔ محض کسی کی شہوت رانی کا آلہ نہ بنو۔ مگر افسوس ہے کہ ہمارے بعض فقہاء نے کس دلیری سے لکھ دیا ہے کہ اِنَّ وَطْیَ الْاَمَۃِ یُقْصَدُ بِھَا قَضَاءُ الشَّھْوَۃِ دُوْنَ الْوَلَدِ[1] (ہدایۃ باب العتاق)۔ ان روایات موضوعہ نے کیسے کیسے اکابر کی ذہنیت بدل دی۔ فیا حسرتاہ!

ملک یمین کے معنی میں ایک الجھاؤ محرمات کی تفصیل جو آخر پارۂ چہارم سورہ نساء میں مذکور ہے، اُس میں جہاں سے پارۂ پنجم شروع ہوتا ہے، والمحصنٰت من النساء الا ما ملکت ایمانکم اس فہرست محرمات کی آخری کڑی ہے۔ یعنی شوہر دار عورتیں بھی تم پر حرام ہیں، بجز تمہاری ملک یمین کے۔ یعنی تمہاری ملک یمین جو شوہر دار نہ ہوں، تم پر حلال ہیں، یعنی تم اُن سے نکاح کر سکتے ہو۔

یہاں مفسرین کیوں نہیں اِلَّا مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ کے عموم سے فائدہ اُٹھاتے؛ اگر لونڈی کا کسی سے نکاح کر دینے کے بعد بھی وہ لونڈی ہی رہتی اور اُن کے نزدیک بلا نکاح لونڈی کو فراش بنانا جائز ہے، تو پھر اس آیت کے رو سے تو وہ لونڈی اپنے آقا اور شوہر کے درمیان ایک مشترکہ فراش رہے گی۔ کیوں کہ اس آیت کے عموم لفظ سے شوہر دار لونڈی آقا کے لیے حلال ہے۔

مگر یہاں فقہاء گھبرا کر بلا دلیل عموم لفظ سے گریز کر کے تخصیص کے قائل ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہاں وہ شوہر دار ملک یمین مراد ہیں جن کے شوہر دار الحرب میں ہیں، یا قیدی کی حیثیت سے کسی کے ہاں غلامی کے دن گزار رہے ہیں اور وہ ملک یمین یعنی لونڈی اہل کتاب ہو یا مسلمان ہو گئی ہو۔ چاہے اُس کا شوہر بھی اہل کتاب ہی کیوں نہ ہو، یا غلامی کے بعد مسلمان ہی کیوں نہ ہو گیا ہو۔ وہ لونڈیاں جن کا نکاح آقا ہی کی اجازت سے کسی دوسرے سے ہو گیا ہو وہ یہاں مراد نہیں ہیں۔ اس لیے کہ غلامی سے پہلے وہ جس شوہر کی محصنہ تھی، اس سے اس کا تعلق فراشی غلامی کی وجہ سے منقطع ہو چکا۔ اب یہ اپنے آقا کی فراش بن سکتی ہے اور یہ فراش مشترک نہ ہوگا اور جس سے اُس کا نکاح آقا کی اجازت سے ہوا ہے، چاہے وہ آقا کا غلام ہی کیوں نہ ہو، اس سے آقا ہی نے اس کا تعلق فراشی قائم کر دیا۔ اس لیے آقا کو اب اس سے خود تعلق فراش قائم کرنا جائز نہ ہوگا۔

مجھ کو نہ اس مراد میں کوئی شبہ ہے نہ اس دلیل میں۔ بات تو بالکل صحیح ہے۔ میں بھی یہی کہتا ہوں، مگر میرے پاس اس کی قرآن ہی سے دلیل ہے: وہ یہ کہ آقا نے اگر اپنی لونڈی کا نکاح کسی دوسرے سے کر دیا تو وہ آزاد ہو گئی۔ اب اپنے آقا کی لونڈی رہی ہی نہیں، اس لیے وہ حقیقی معنی میں مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ ہی نہیں رہی تو پھر وہ تو والمحصنٰت من النساء میں داخل[2] ہونے کی وجہ سے محرمات میں ہے۔ الا ما ملکت ایمانکم میں داخل ہی نہیں رہی کہ المحصنٰت سے مستثنیٰ ہو اور حلال سمجھی جائے۔ تو جب یہاں وہ ملک یمین جس کا نکاح آقا نے اپنی اجازت سے خود کسی سے کر دیا ہے۔ وہ یہاں مراد ہی نہیں ہو سکتی تو پھر کون سی ملک یمین مراد ہوگی؟ وہی ہوگی جو قید سے پہلے شوہر دار تھی اور اب قید ہو کر ملک یمین بنی ہے۔ جیسا کہ اوپر گذرا۔

مگر جو لوگ لونڈی کو بیاہ دینے کے بعد بھی لونڈی ہی باقی رکھتے ہیں، اُس کو آزاد نہیں قرار دیتے، وہ کسی دلیل شرعی سے یہاں الا ما ملکت ایمانکم سے اس لونڈی کو خارج قرار دیتے ہیں جس کا نکاح آقا نے اپنی اجازت سے خود ہی کر دیا ہو، کیوں کہ وہ شادی شدہ بھی ہے اور ملک یمین بھی۔ اشتراک فراش کی وجہ تو فقہاء کی خود ساختہ محض قیاسی وجہ ہے، کہنے والا کہے گا کہ جب قرآن نے اس موقع پر اشتراک فراش کی اجازت دے دی ہے تو آپ محض قیاس کی بنا پر بلا دلیل قطعی اس کو حرام کرنے والے کون؟ کیا اللہ تعالیٰ نہیں جانتا تھا کہ اس صورت میں اشتراک فراش

---

[1] لونڈی سے وطی کرنا محض شہوات رانی کے لیے ہوتا ہے، نہ کہ اولاد کے لیے (مدیر)

[2] جب آپ لونڈی کو المحصنٰت من النساء میں داخل کرتے ہیں تو فانکحوا ما طاب لکم من النساء مثنیٰ وثلٰث وربٰع سے مستثنیٰ کر کے بے تعداد کا جواز کہاں سے نکالتے ہیں، آخر لونڈی ہونے سے کوئی عورت نسائیت سے خارج تو نہیں ہو جاتی اور اس میں آپ صراحتاً ہم سے متفق ہیں (مدیر)

ہو جائے گا ؟ عام اشتراکِ فراش اگر معیوب ہے تو محض عقلی۔ کوئی نص صریح اس کی حرمت کی پیش نہیں کی جاسکتی۔ یہاں اسی اشتراک کی ممانعت کے لیے والمحصنٰت من النساء کو حرام کیا گیا ہے جس سے مِلکِ یمین کو مستثنیٰ کیا گیا۔ اس لیے مِلکِ یمین کے ساتھ آپ اشتراکِ فراش سے مجھ کو کیوں روکیں گے ؟ ہمارے فقہاء کے پاس درحقیقت اس کا کوئی جواب نہیں ہے اور یہ ساری خرابی صرف اس وجہ سے ہوئی ہے کہ لونڈی کو بلا نکاح فراش بنانے کا جواز انہوں نے فرض کر لیا ہے۔ ورنہ اِس الجھاؤ میں کبھی نہ پڑتے۔

مختصر یہ کہ یہ آیت اس کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ جب آقا نے اپنی لونڈی کا نکاح کر دیا تو پھر وہ آزاد ہو گئی اور اس کی مِلکِ یمین باقی نہ رہی۔ اگر آقا نے خود نکاح کیا تو زرِ فدیہ مہر بن کر ادا ہو گیا اور وہ آزاد ہو گئی اور اگر آقا نے کسی دوسرے سے اُس کا نکاح کر دیا تو اُس دوسرے کے ذمے جو اس لونڈی کا مہر ہوگا وہ مہر لونڈی اُس سے لے کر آقا کو زرِ فدیہ ادا کرے گی۔ چاہے جس وقت مہر ملے۔ اگر آقا نے مہر معجل طے کیا، اور مؤجل ہی رکھا تو یہ قصور آقا کا ہے۔ جس وقت مہر ملے گا اس وقت وہ آقا کو ادا کر دے گی، مگر نکاح کے ساتھ ہی وہ آزاد ہو گئی اور زرِ فدیہ میں گرو نہ رہی۔ اس لیے کہ اب زرِ فدیہ کی صورت قرض کی ہوگی۔ چوں کہ آقا نے خود ہی مہر کو مؤجل رکھا۔ اگر مہر معجل ہی پر نکاح کی اجازت ...... دیتا تو اسی وقت فدیہ ادا ہو جاتا۔ تو یہ دیری آقا کے فعل سے ہے، اس کا اثر اس مِلکِ یمین غریب پر کیوں پڑنے لگا ؟

ہاں اگر آقا اپنی لونڈی کا نکاح اپنے ہی غلام سے کر دے، یا کسی دوسرے کے غلام سے کر دے تو کیا ہوگا ؟ یہ سوال باقی رہ جاتا ہے مگر اُس کے ساتھ ساتھ یہ سوال بھی رہ جاتا ہے کہ اگر غلام کا نکاح کر دیا جائے تو لونڈی کی طرح غلام بھی آزاد ہو جائے گا یا نہیں ؟ تو ان دونوں سوالوں کا جواب ابھی آتا ہے، پہلے ذرا لونڈی غلام کا فرق سمجھ لیجئے۔

لونڈی غلام کا فرق ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ لونڈی غلام میں کوئی فرق نہیں اس کا مطلب نہ تھا کہ عورت و مرد ہونے کا بھی فرق نہیں۔ وہاں یہ بیان کرنا مقصود تھا کہ دونوں کی اسیری، دونوں پر زرِ فدیہ کا عاید ہونا، پھر دونوں کا گرو ہونا اور دونوں کی غلامی کی زندگی بسر کرنا بالکل یکساں ہے۔ ان باتوں میں کوئی فرق نہیں۔ اس لیے جو حق آقا کو غلام پر حاصل ہوتا ہے، وہی حق بلا فرق لونڈی پر بھی حاصل ہوتا ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ لونڈی پر فراش بنانے کا ایک فاضل حق حاصل ہو جائے۔ اگر کوئی خریدتا ہے تو جس طرح غلام خریدتا ہے اسی طرح لونڈی خریدتا ہے اور وہی حق خریدتا ہے جو اُس کے شرع اُس پر آقا ہونے کی حیثیت سے حاصل تھا، نہ کہ کوئی فاضل حق خرید کر حاصل کر سکتا ہے۔

یہاں جو فرق مجھ کو بیان کرنا ہے، وہ دوسرے اعتبار سے ہے، جس کا تعلق ان کے صنفی امتیاز سے ہے۔ اس لیے کہ مرد نکاح کرتا ہے تو اُس کے ذمے عورت کا مہر عائد ہوتا ہے اور عورت نکاح کرتی ہے تو وہ مرد سے مہر وصول کرنے کی حق دار ہو جاتی ہے۔ آقا اگر اپنی لونڈی سے نکاح کرے گا تو آقا زرِ مہر ادا کرے گا اور لونڈی کے ذمے زرِ فدیہ آقا ہی کا باقی ہے۔ اِس لیے اُس کے ذمے باقی اور اِس کا اُس کے ذمے واجب الادا، دونوں باہم حسابِ دوستاں در دل کر لے سکتے ہیں، مگر عورت اگر اپنے غلام سے نکاح کرنا چاہے تو عورت کا پہلے سے زرِ فدیہ تو اس غلام کے ذمے باقی ہی ہے وہ تو ابھی ادا ہی نہ ہو سکا۔ اب پھر زرِ مہر بھی اس غلام کے ذمے عاید ہو، پھر نان و نفقہ بھی عاید ہو، یہ بالکل خلافِ عقل ہے جو زرِ فدیہ ادا کر کے خود اپنے گلے سے غلامی کی پھانس نہ چھڑا سکا، وہ بیوی کا زرِ مہر اور نان و نفقہ کیا ادا کرے گا، چاہے وہ اپنی آقا عورت سے نکاح کرے، چاہے کسی دوسری عورت سے۔ اس لیے کہ مردوں کو تو حکم ہے ابتغاء بمالہ کا۔ اگر اس کے پاس مال ہے تو سب سے پہلے زرِ فدیہ ادا کر کے غلامی کی پھانس سے اپنی گلو خلاصی کا سامان کرے۔ اس کے بعد ایک نیا بار اپنی گردن پر لے۔ کیوں کہ مردوں کو جو حکم ہے کہ تم نکاح کرو، عورت کو محصنہ بنانے کی نیت سے، اور اُس سے بالمال ابتغاء استمتاع کرو۔ تو جو شخص خود دوسرے کے احسان میں ہے اپنی غلامی کی وجہ سے وہ کسی غیر کو اپنی محصنہ کس طرح بنا سکتا ہے اور جو مال کے ذریعہ اپنی گلو خلاصی نہیں کر سکتا، وہ استمتاع کا ابتغاء بالمال کیا کرے گا۔

غرض غلاموں کو لونڈیوں کے اعتبار سے دشواریاں زیادہ ہیں۔ عورتیں فطری ضعف کی وجہ سے سہولت مزید کی محتاج بھی تھیں، اس لیے دین

فطرت کے روسے ان کے لیے خود بخود سہولتیں بہم پہنچ گئیں۔ یہ نکاح کے ساتھ ہی آزاد ہو جاتی ہیں اور غلام جب تک آزاد نہ ہو، نکاح نہیں کر سکتا بلکہ اگر اپنے غلام سے خود نکاح کرنا چاہے تو وہ کر سکتی ہے مگر پہلے اُس کو آزاد کر دے، اس کے بعد اُس سے نکاح کرے۔ چاہے اُس کے بعد زرمہر بھی معاف کر دے۔ نان ونفقہ بھی معاف کر دے۔ یہ سب اُس کے اختیار میں ہے۔ چاہے آزاد ہونے کے بعد غلام اپنی محصنہ سے نکاح کر کے بعد کو بمرور زرمہر کما کر ادا کر دے یا یکمشت ادا کر دے۔ اسی طرح نان ونفقہ بھی کما کر ادا کرتا رہے۔

آقا اگر اپنے غلام کا کسی سے نکاح کرنا چاہے تو پہلے اُس غلام کو آزاد کر دے تاکہ وہ اپنے آقا کے احسان اسیری سے آزاد ہو کر اپنی منکوحہ کو اپنی محصنہ بنا سکے۔ اسی لیے جو وانکحوا الایامی منکم والصالحین من عبادکم وامائکم فرمایا گیا ہے۔ اس میں درحقیقت اُن کی آزادی اور ان کے فکِ رقبہ کی صورت بھی مضمر ہے۔ مطلب یہی ہے کہ ایسا نہ ہو کہ ان کے آزاد ہو جانے کے ڈر سے تم ان کا نکاح ہی نہ کرو۔ البتہ غلاموں کے متعلق یہ ہو سکتا ہے کہ ان کے ذمے زرفدیہ جو واجب الادا ہے اور یہ اس میں گرو ہیں، جب ان کا نکاح کر دیا جائے تو وہ زرفدیہ معاف کر کے ان کو بالکل سبکدوش نہ کر دیا جائے۔ بلکہ وہ زرفدیہ اب اُن کے ذمے بطور قرض کے باقی رہے جس کو یہ باقساط ادا کر دیں۔ یعنی مکاتبت کی نوعیت قائم کر دی جائے تاکہ فنظرۃ الی میسرۃ کی تعمیل ہو اور اس غلام کے لیے سبکدوشی سہل ہو جائے۔ مگر بہرحال نکاح کے بعد وہ زرفدیہ میں گرو نہیں رہ سکتا۔ وہ آزاد مگر مقروض رہے اور بس۔[ھ]

اس لیے آقا نے اگر اپنی ہی لونڈی کا نکاح اپنے ہی غلام سے کرنا چاہا تو ظاہر ہے کہ غلام کے پاس مال ہے یا نہیں؛ اگر ہے تو سب سے پہلے وہ اپنا زرفدیہ ادا کر کے غلامی سے آزاد ہو جائے۔ اس کے بعد اس قابل ہو گا کہ وہ اپنے آقا کی لونڈی سے ابتغاء استمتاع بمالہ کر سکے اور اُس کو محصنہ بنا سکے۔ اس کے بغیر نہ وہ ابتغاء بمالہ کر سکتا ہے، نہ کسی کو اپنی محصنہ بنا سکتا ہے اور اگر اس کے پاس مال نہیں ہے تو پھر یہ ابتغاء بمالہ کر ہی نہیں سکتا، بجز اس کے کہ آقا پہلے احساناً اُس کو آزاد کر دے۔ اس کے مہر مؤجل پر اپنی لونڈی سے اُس کا نکاح کر کے لونڈی کو بھی آزاد ہو جانے کا موقع دے۔ جب یہ کما کر بیک دفعہ یا بدفعات اس کی لونڈی کا مہر ادا کر دے تو وہ لونڈی اپنا مہر اپنے فدیہ میں آقا کو ادا کر دے یا لونڈی کو بھی آقا احساناً آزاد کر دے اور اگر آقا اپنے پاس سے اپنی لونڈی کا زرمہر ادا کر کے اپنے غلام سے اس کا نکاح کر دینا چاہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ آقا نے زرفدیہ اُس غلام کا معاف کر دیا۔ جب تو اپنے پاس سے فاضل روپے دے کر وہ اُس کو ابتغاء استمتاع بالمال کا موقع دے رہا ہے۔ ورنہ کم سے کم یہ غلام آزاد ضرور ہو جائے گا اور وہ زرفدیہ اُس کے ذمے بطور قرض کے رہے گا۔ تاکہ یہ آزاد ہو کر اپنی بیوی کو اپنی محصنہ بنا کر رکھ سکے اور یہی نوعیت اُس صورت میں ہو گی کہ ایک شخص اپنی لونڈی کا نکاح دوسرے کے غلام سے کرنا چاہے۔ وہ دو سوال جو رہ گئے تھے، اُن کے جوابات بھی آپ کو مل گئے۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

من ملک ذارحم محرم | یعنی کوئی قیدی اپنے کسی ایسے قرابت مند کا غلام نہیں رہ سکتا جو اُس کا محرم ہو۔ یہ ایک ایسا متفق علیہ مسئلہ ہے جس کو سارے فقہاء و محدثین مانتے ہیں اور اس کے متعلق حدیث صحیح بھی وارد ہے۔

میں اپنے اس موضوع میں صرف قرآنی آیات صحیحہ اور انھیں پر مبنی قیاسات قطعیہ کے ذریعہ بحث کرنے کا عزم کر چکا ہوں۔ اس لیے جو مسائل کہ صرف احادیث سے نکالے گئے ہیں۔ اس موضوع بحث میں اگر وہ روایت مخالف قرآن ہے تو میں اُن کی تردید کے متعلق کسی ضمنی بحث میں کچھ تصریح کر سکتا ہوں، مگر جب تک قرآن مجید کی کوئی آیت بھی اُس کی تائید میں نہ ہو۔ استدلال واحتجاج کی نیت سے نہیں پیش کر سکتا۔ اس موضوع کے متعلق جو روایت ہے، باوجود صحیح ہونے کے اس کی تائید میں کوئی قرآنی آیت نہیں ہے۔ اس لیے اصولاً یہاں مجھے اس کو پیش کرنا نہیں چاہیے۔

ھ ماملکتم مفاتحہ کی شرح میں آپ نے ان کی غلامی اور گھر بار والا ہونا، دونوں باتیں بیک وقت تسلیم کر لی ہیں۔ یہاں نکاح اور غلامی اکٹھا کرنے کی سعی فرما رہے ہیں۔

(مدیر)

لیکن چوں کہ قرآنی احکام سارے کے سارے بعبارۃ النص ہی نہیں نکلتے، بعض احکام باقتضاء النص بعض بدلالۃ النص اور بعض باشارۃ النص بھی نکلتے ہیں اور اقتضاء النص وقت عبارۃ النص پر بھی ترجیح رکھتا ہے اور یہ حدیث قرآنی اقتضاء النص کے بالکل مطابق ہے۔ اس لیے حدیث کی عبارۃ النص اور قرآن کے اقتضاء النص دونوں کو ملاکر یہ چیز ایسی قوی ہو گئی کہ نظر انداز نہیں کی جاسکتی۔ بدیں وجہ اس کو پیش کر رہا ہوں۔ اگرچہ اس کی بحث مختصراً پہلے آ چکی ہے۔ مگر وہ دوسری حیثیت سے تھی۔

غلاموں اور جنگ کے قیدیوں کے متعلق جتنی آیتیں ہیں سب پر نگاہِ غور ڈالنے سے یہ صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ حتی الوسع اُن کو آزاد ہی کر دینا چاہیے خواہ مخواہ اُن کو غلام بنائے رکھنا قرآن مجید کبھی پسند نہیں فرماتا۔ قیدیوں کے متعلق پہلے احساناً ہی چھوڑ دینے کے لیے ارشاد ہوا۔ اس کے بعد فدیہ وصول کرکے آزاد کرنے کا حق بھی دیا۔ اگر وہ فدیہ ادا نہ کریں تو جب تک ادا نہ کریں اُس وقت زر فدیہ میں گرو رکھنے کے لیے باقتضاء النص یا باشارۃ النص موقع بھی دیا۔ تو جس طرح زر فدیہ میں گرو رکھنے اور اس گرو کی وجہ سے لونڈی غلام بنائے رکھنے کا حکم بعبارۃ النص قرآن سے نہیں نکلتا بلکہ باقتضاء النص و باشارۃ النص نکلا ہے۔ بالکل اسی طرح یہ حکم بھی یہیں سے نکل آیا کہ اگر بوقت تقسیم یا بذریعہ خریداری کسی کے حصہ میں ایسے ملک یمین پڑیں کہ اُن میں اور اُن کے ملک یمین میں ازروئے قرابت رحمی محرمیت اور وراثت ہو تو وہ ملک یمین خود بخود آزاد ہو جائے گا۔ اس لیے کہ ملک یمین تو زر فدیہ ادا نہ کر سکنے کی وجہ سے اپنے فدیہ میں گرو ہے اور جب وہ غریب خود فدیہ ادا کر نہیں سکتا تو یقیناً اُس کی طرف سے اس کے کسی رشتہ دار ہی کو جو اُس کا محرم ہو اور جس سے اس کے ساتھ توارث ہو سکے وہی فدیہ ادا کرتا۔ اس لیے کہ قرآن ہی سے یہ ثابت ہے کہ اگر قیدی خود فدیہ ادا نہ کر سکے تو اس کے محارم و متوارثین اس کی طرف سے فدیہ ادا کریں گے۔ قرآن مجید (سورہ بقرہ) میں ہے: وَاِنْ یَّاْتُوْکُمْ اُسٰرٰی تُفٰدُوْھُمْ وَھُوَ مُحَرَّمٌ عَلَیْکُمْ اِخْرَاجُھُمْ ط اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْکِتٰبِ وَتَکْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ قیدیوں کی طرف سے اُن کے اہل قرابت قریبہ کا فدیہ ادا کر دینا بھی "بعض الکتاب" ہے یعنی اگلی کتابوں کی بعض آیتوں میں اس کا حکم ہے اور اگلی کتابوں کے جس حکم کا ذکر بر سبیل تذکرہ بھی قرآن مجید میں آجائے تو وہ حکم ہر مسلین کے لیے بھی اُسی طرح ہو جاتا ہے جس طرح دوسرے قرآنی احکام ہیں۔ جیسا کہ اِنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ والا حکم ہے کہ بر سبیل تذکرہ فرمایا گیا کہ ہم نے یہود پر تورات میں قصاص جانی کا یہ اصول قائم کر دیا تھا۔ مگر وہی بر سبیل تذکرہ مذکور آج تک ایک اسلامی قانونِ مستقل ہے۔ تو جب اپنے خاص قرابت دار قیدی کی طرف سے فدیہ ادا کرنا بھی ہر مسلم پر ازروئے کتاب اللہ فرض ہے تو جب وہ قیدی خود اُسی کے حصّہ میں پڑا، یا اُس نے کسی ایسے ملک یمین کو خرید کیا تو پھر اُسی کا مطالبۂ فدیہ خود اسی کے ذمے عاید ہو گیا۔ اُسی کا زر فدیہ چاہیے بھی۔ اور پھر اُسی کو ادا بھی کرنا چاہیے۔ اس لیے اُس کو خود اپنے ہی سے زر فدیہ وصول ہو گیا، یا یوں کہیے کہ اس کا مطالبۂ فدیہ ساقط ہو گیا اور وہ ملک یمین آزاد ہو گیا۔ .. .. چاہے وہ غلام ہو یا لونڈی۔ اس لیے وہ حدیث بالکل صحیح اور قرآن مجید کے بالکل مطابق ہے اور فقہا و محدثین کا اس پر اجماع بھی بالکل درست ہے۔ مگر افسوس کہ ان متفقہین نے اس کی اصل وجہ پر پوری طرح غور نہیں فرمایا۔ یہ متفق علیہ مسئلہ درحقیقت اس کی روشن دلیل ہے کہ کوئی ملک یمین بھی مملوک تام نہیں ہے بلکہ صرف اپنے زر فدیہ میں گرو ہے اور ایک قیدی سے زیادہ اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ جس وقت بھی وہ اپنا فدیہ ادا کر کے آزاد ہو جائے گا اور احساناً آزاد کر دیے جانے کا تو ہر وقت مستحق ہے، خصوصاً اسلام لا چکنے کے بعد۔

وراثت سے محرومی | محرومین وراثت میں جہاں کفر اور قتل مورث بالعمد وغیرہ کو باعث حرمان ارث وارث کے لیے فقہا نے قرار دیا ہے، وہاں اس غلامی کو پورے عموم کے ساتھ سبب محرومی قرار دے دیا ہے۔ یہاں تک کہ اگر غلام یا لونڈی مکاتب ہو اور اس کو زر کتابت ادا کرنا ہے اور اُس کا کوئی مورث مسلم مر گیا تو باوجود اُس کے مسلم ہونے کے اس غریب کو اپنے مورث کے ترکے میں سے کچھ نہیں مل سکتا۔ یعنی یہ چاہے کہ مورث کا ترکہ پاکر اس سے زر کتابت ادا کر دے تو اس کو یہ حق نہیں۔ اگر سارا زر کتابت ادا کر چکا ہے، صرف ایک آنہ پیسہ باقی رہ گیا ہے اور مدت کتابت بس ایک ہی دن باقی ہے، اگر یہ اس ایک دن میں وہ ایک آنہ پیسہ ادا نہ کرے تو دوسرے دن اس کا سارا پہلا ادا کردہ زر کتابت سوخت ہو جائے گا اور یہ پھر

غلام کا غلام ہی رہ جائے گا۔ مگر مورث کے ترکے میں سے ایک آنہ پیسہ لے کر یہ پورا زرِ کتابت ادا کر کے غلامی کی لعنت سے اپنے آپ کو رہا نہیں کرا سکتا۔ یہ ہے ہمارے علماء و فقہاء کا انصاف اور ان کی رواداری اور حق شناسی۔

اگر ان فقہاء سے کوئی پوچھے کہ اس غلام کا باپ ایک مسلم آزاد تھا۔ یہ جنگ میں اسیر ہو کر فدیہ ادا نہ ہو سکنے کی وجہ سے فدیہ میں گرو ہو کر کسی دوسرے مسلم کے حصہ میں پڑا اور پھر ایمان لے آیا اور مسلم رہا۔ باپ کسی وجہ سے یا کمی مال کی وجہ سے اس کا فدیہ ادا کر کے اس کو آزاد نہ کرا سکا۔ یا یہ کہ پہلے اس کی حالت کفر میں رہنے کی وجہ سے اس کی رہائی کی طرف توجہ نہ کی تھی، اسلام لانے کے بعد وہ اس فکر میں تھا کہ کچھ رقم مہیا ہو جائے تو اس کا زرِ فدیہ ادا کر کے یا باصطلاح متعارف اس کو خرید کر آزاد کر دوں مگر اس کا موقع ابھی نہ ملا تھا کہ باپ مر گیا۔ یا باپ نہ ہو کوئی دور کا قرابت مند ہو اور لاولد ہو، کلالہ ہو، اور یہی غلام مسلم حسن اتفاق سے اس کا عصبہ ہوتا ہو غرض کسی طرح بھی ہو، کسی مورثِ مسلم کا اس کو ترکہ مل رہا ہے۔ اگر یہ غلام نہ ہوتا تو ضرور وارث ہوتا اور اس کو ضرور ترکہ مل جاتا۔

مگر چوں کہ فقہاء کی وہ نص قطعی جو بلا واسطۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاص اُن پر عرشِ معلّٰی سے اُتری ہے یعنی وہی مال العبد مال المولیٰ والی آیت عرشی جو لوحِ محفوظ سے ٹپک پڑی ہے، اسی نے ان کو تفقہ پر مجبور کر دیا کہ اگر اس کو غلامی کی حالت میں ترکہ ملے گا تو اُس کی ملک تو وہ رہے گا نہیں۔ وہ مال متروکہ جو اس کو ملے گا، اس سے اس کے مولیٰ کی طرف منتقل ہو جائے گا اور اس کا مولیٰ اس کا مالک ہو جائے گا۔ ترکہ کسی کا، اور مل جائے گا کسی کو۔ اس لیے یہ غلام ہی سرے سے محروم الارث بنا دیا جائے۔

مگر اس کے لیے بھی کسی دلیل کی ضرورت محسوس ہوئی تو وہی آیت لا یقدر علی شئ والی جو سورہ نحل میں ہے اور جس پر صفحہ ۶ میں پوری بحث ہو چکی ہے، پیش کر کے لا یقدر کو لا یملک کا ہم معنی قرار دے کر یہ کہہ دیا گیا کہ اگر اس کو ترکہ دیا گیا تو یہ خود تو ترکہ کا مالک ہو ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ قرآن میں غلام مملوک کے متعلق لا یقدر علی شئ ہے اور اس کے معنی ہیں لا یملک علی شئ تو جو خود کسی چیز کا مالک نہ ہو سکے اس کو مال متروکہ کا مالک کس طرح بنایا جا سکتا ہے۔

غرض یہی سب تاویلات و تسویلات پیش کر کے اس غلام غریب کو یہ باپ کے ترکہ سے بلا دلیل اور بلا وجہ محروم قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ قرآن مجید کا حکم بالکل عام اور ہر طرح مطلق ہے۔ یوصیکم اللہ فی اولادکم میں مسلم اُساریٰ یعنی جنگ کے وہ قیدی جو زرِ فدیہ ادا نہ کر سکنے کی وجہ سے اپنے زرِ فدیہ میں گرو ہیں اور غلامی کی زندگی باوجود اسلام لانے کے گزار رہے ہیں، ان کو اس حکم اور اس وصیت کی مخاطبت سے، چاہے وہ مورث ہوں یا وارث کس دلیل قطعی کے رو سے مستثنیٰ قرار دیا جا سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ جو عموم اور جو اطلاق کہ بدلیل قطعی مذکور ہو، اگر اس کی تخصیص یا تقیید ہو سکتی ہے تو وہ بھی قطعی ہی دلیل سے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ لا یقدر علی شئ کے معنی لا یملک علی شئ کسی ظنی دلیل سے بھی ثابت نہیں ہو سکتا قطعی دلیل کہاں سے اُس کے لیے آئے گی اور مال العبد مال المولیٰ تو قیامت تک قرآن حکیم سے صحیح نہیں ثابت کیا جا سکتا، جو خود ایک شیطانی تسویل ہے وہ نص قرآنی کی مخصص و مقید کیا ہو سکتی ہے؟

تمنا عمادی مجیبی پھلواری شریف (پٹنہ)

آپ کے بہت معترضین آپ کو پیچھے لے جانے کی کوشش کریں گے (لَتَعُودُنَّ فِی مِلَّتِنَا) لیکن میں آپ کی تحقیق کا صدق دل سے خیر مقدم کرتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ آپ کے ساتھ مل کر طالب علمانہ طریق پر ذرا اور آگے قدم اٹھاؤں۔ مشرحِ صدر دو آیتوں اور آیہ مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَاءِ الخ پر گہری نظر ڈالنے سے مجھے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آزاد عورتیں اگر خود برداشت کریں تو چار تک جائز ہو سکتی ہیں لیکن لونڈی ایک بھی بحالت مجبوری ہی گوارا کی جانی چاہیے، آیئے ایک دفعہ پھر غور کریں:

وَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۔ طَابَ فعل مقدم اور النساء کو فاعل قرار دے کر تقدیر عبارت یوں ہو سکتی ہے کہ فانکحوا من النساء التی طبن لکم، یعنی ان دو، تین، چار عورتوں کو اپنے نکاح میں لاؤ جو تم کو پسند کریں یا تمہارے پاس مل کر رہنا گوارا کریں۔ عام معنی یہ کیے جاتے ہیں: "نکاح کرو عورتوں میں سے جو تمہیں اچھی لگیں"۔ یعنی فانکحوا ماطبتم من النساء - اس پر آپ غور کریں کہ گرامر اور اس کے بعد بشری فطرت اور نسوانی نفسیات کی رو سے ان دونوں معنوں میں سے کون سے اصح ہیں۔ پھر اس کے ساتھ آیہ مبارکہ "لن تستطیعوا ان تعدلوا بین النساء ولو حرصتم" کے مقتضیٰ کو بھی دیکھ لیں کہ اگر عورتیں خود ہی صحیح عدل کو معاف نہ کریں تو کوئی صورت اجتماع ازواج کی ممکن نہیں مگر مرد کو امکانی سعی عدل کبھی معاف نہیں ہو سکتی۔

اب آگے چلیے ـــــ فانکحوا ھن باذن اھلھن اور فانکحوا الایامی منکم و عباد الصالحین پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ لونڈی سے نکاح کرے وہ جو آزاد عورت سے نکاح کی استطاعت نہ رکھتا ہو، یا غلام سے اس کا نکاح کرا دیا جائے، لیکن ترجیح اسی بات میں ہے کہ لونڈی کے نکاح کی نسبت صبر ہی اختیار کیا جائے (وان تصبروا خیر لکم) قرآن کی مرضی تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ ایسے سہاگ سے رنڈاپا اچھا، یعنی ایسی عورت سے نکاح ہی کیا جو دوسرے (آقا) کے حکم میں ہو۔ اب رہے صاحب استطاعت لوگ وہ شائستہ اور تربیت یافتہ شریف زادیوں کی توفیق رکھتے ہوئے مجہول الحال لونڈیوں سے دل لگی کیوں کریں۔ بے شک وہ ایک سے یا چار سے بھی زیادہ لونڈیوں کو خرید سکتے ہیں۔ لیکن لونڈی غلام تو ان کے پاس بمنزلہ اولاد رہیں گے (کما فی سورۃ النور) اور اولاد سے نکاح کیسا؟

اگر ضرورت ہوئی تو اس نکتہ کو زیادہ تشریح سے پیش کیا جا سکتا ہے۔ و باللہ التوفیق (مدیر)

ہمارا کتب خانہ

تفسیر بیان للناس منزل اول مجلد	۱۲ر	تعلیمات القرآن	عا	شانِ خدا	عہ	تفسیر سورہ فاتحہ ..	۲ر
〃 〃 دوم	عہ	علم حدیث	۳ر	محمد رسول اللہ	۸ر	اقبال کی پیش گوئیاں ..	۲ر
〃 〃 سوم	عہ	مقدمہ زندگانی محمدؐ ..	۱۰ر	دل کی آواز	۱۲ر	مقدمہ دعوت الرسل ..	۲ر
〃 〃 چہارم	۱۲ر	ملتِ ابراہیمؑ (جدید اڈیشن) ..	۵ر	آخری فیصلہ	عہ	صراط مستقیم ..	عہ
〃 〃 پنجم	۱۲ر	تحقیق قربانی 〃	۶ر	ختم نبوت ..	۳ر	تقلید و تحقیق ..	۴ر
〃 〃 ششم	عا	جنت کا گہنا (نظم)	ار	ذبح عظیم	۳ر	حیات و ممات کا معمہ ..	۲ر
〃 〃 ہفتم	۱۲ر	کامیاب زندگی	۱۲ر	حقیقت الصلوٰۃ	۸ر	قیامت	۴ر
الوراثت فی القرآن	عہ	مطالعہ حدیث	عہ	اوصاف رسول کریمؐ ..	۸ر	فلسفہ روحانی ..	۲ر
برگ سبز	۳ر	صفات القرآن	۴ر	قول احسن	۲ر	مسیح و احمد	۲ر
ریحان القرآن	۶ر	نشاۃ ثانیہ	۱۰ر	کلیات طغرائی	عا	براہین وحی	۱۲ر
برہان القرآن	۱۲ر	جواہر العلوم	عا				

(پتہ) **دفتر امت مسلمہ، توحید باغ، امرت سر**

(راما آرٹ پریس سنتوکھ سر امرت سر میں محمد حسین ایڈیٹر، پرنٹر و پبلشر نے چھپوا کر دفتر امت مسلمہ امرت سر توحید باغ سے شائع کیا)